ناول

وفا جن سے کی

عفت موہانی

WAFA JIN SE KI

BY IFFAT MOHANI

RS. 42/- ONLY

1990

قیمت

بیالیس روپیہ

ناشر

نسیم بکڈپو

پہلی منزل ۲۵۔ جی بی مارگ لکھنؤ۔ 260018

فونس: 245334/244559

باہتمام نسیم انہونوی | باراوّل ۱۹۹۰ء | مطبع نامی پریس۔ لکھنؤ

(۱)

کالی گھٹا جھوم کے اٹھی تھی۔ افق مغرب سے بادلوں کے سیاہ خوفناک ہاتھی چنگھاڑتے بجلی کی سونڈوں کے چابک ادھر ادھر مارتے آسمان پر بڑھتے اور پھیلتے چلے جا رہے تھے! موسم انتہا سے زیادہ تند اور خوفناک ہو رہا تھا۔ ہوا بند کھڑکیوں کے نازک شیشوں کو جھنجھوڑ رہی اور ان میں دراڑیں ڈال رہی تھیں۔ دروازے دھڑ ادھر کھل رہے تھے۔ بند ہو رہے تھے۔ غیر محسوس سی پھوار کھڑکیوں سے اندر آ رہی تھی۔ تخت پر بچھی ہوئی خوشنما بیڈ شیٹ جگہ جگہ سے پُر شکن ہونے لگی تھی۔

اس نے کوئی تیسری دفعہ کھڑکی بند کی مگر اس کا بولٹ کچھ خراب تھا۔ پٹ یکبارگی کھلا اور اتنی زور سے اس کے گال پہ لگا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" دالان سے اماں بھی چیخیں۔ "ارے کب سے بھیجہ خالی کر رہی ہوں کہ پانی بوند میں برآمدہ صاف نہ کر مگر سر پہ جانے کون سے آسیب کا سایہ ہے۔ کوئی بات اثر نہیں کرتی میں کہتی ہوں

"صرف نہانے کہہ، جاہل گنوار" اماں کا جی چاہتا تھا کہ اس زبان دراز کی زبان کھینچ لیں۔ یا اپنا سر پیٹ لیں۔ نا ہنجار چکنا گھڑا تھی۔۔ کوئی کچھ کہہ دے۔ مجال نہیں کہ ذرا تو نادم ہو۔ خجالت محسوس کرے۔ اماں بے چاری تیرٹ جاہل سے ہارنے لگی تھیں۔

"چل جا کے نہا، جلدی سے" ممتا سے مجبور ہو کر وہ بولیں۔ "پانی برسنے لگا ہے۔ سردی چمک اٹھے گی۔ گرم پانی سے نہا کر بال اچھی طرح سکھا لیجیو سنا تم نے!"

"سنا!" برا سا منہ بنا کر اس نے کہا۔ اور بھیگا ہوا دوپٹہ اوڑھے چلی تھی کہ اماں نے چھین لیا۔ اور خونخوار انداز میں اسے گھورنے لگی تھیں مجبوراً وہ یونہی سرپٹ چال سے غسل خانے کی طرف دوڑ پڑی۔

اماں نے جلدی جلدی آدھا برآمدہ صاف کیا۔ اور میلے کپڑے اٹھا کر گودام کی طرف چلی گئیں۔ مگر پہلے ہی زوبی نے ٹھیک ٹھاک کر دیا تھا دالان میں رنگین چمکیلے کاغذوں کے لہریے لگائے تھے۔ خوشنما فانوس کے اوپر اس طرح سنہرے روپہلے غبارے اٹکائے تھے کہ وہ فانوس کی تیز روشنی میں عجیب بہار دے رہے تھے۔ جب ہوا انھیں چھیڑتی اور وہ ہولے ہولے ہلتے جھومتے تب بے حد دلکش لگتے۔

بڑے تختوں پر جھالردار کور پڑے تھے۔ کرسیاں ایک طرف قرینے سے لگی تھیں رنگین ٹی وی پر نیا غلاف پڑا تھا۔ دروازوں پر لکیوں کے بیر دے۔ جو مسلسل بج رہے تھے۔ اور ترنم بکھیر رہے تھے۔

باورچی خانے کے آگے کھلی جگہ میں باورچی اور خادمہ بڑے مصروف تھے۔ طرح طرح کی اشتہا انگیز خوشبوئیں فضا میں پھیلی ہوئی تھیں!

"کیا بات ہے؟" دفعتاً رضا نے چونک کر کہا۔ "ابھی تک افتخار کا پتہ نہیں۔ میں نے تاکیداً کہہ دیا تھا۔ کہ چھ بجے تک ضرور چلے آنا۔ کہیں بھول تو نہیں گئے۔ یا پھر ہوسٹل میں انتظام کرنے کے چکر میں لگے ہوں گے۔"

"کیا وقت ہوا ہے۔" امیر احمد نے کہا۔ ساتھ ہی انھوں نے کف سرکا کر کلائی پر نظر ڈالی۔ آتے ہوں گے۔ ابھی تو سوا چھ بجے ہیں۔ تاکید تو میں نے بھی کر دی تھی۔"

"میں نے جب ان سے کہا کہ اماں کے ہاں اتنی مدت گزار لینا تب کچھ خاموش ہو گئے۔" "یہاں کا قیام پسند نہیں ہے کیا۔؟" رضا نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" امیر احمد نے جواب دیا۔ "میں نے تو اس خیال سے ان سے کہا تھا کہ میں ہفتہ ہفتہ بھر گھر سے دور رہتا ہوں شبیر ابھی بچہ ہے۔ اماں اور زبیدہ تنہا ہوتی ہیں۔ وہ یہاں رہیں گے۔ کم سے کم مجھے تو بڑی بے فکری ہو جائے گی۔ اتنا بڑا صحن ہے۔ پرلی طرف دیوار میں رخنہ پڑ گیا ہے۔ وہاں سے کوئی شخص آسانی کے ساتھ گھر میں آ سکتا ہے۔ ساری گرمیاں بس ارادہ ہی کرتے گزر گئیں۔ کہ مزدور کو بلواؤں وہ رخنہ ٹھیک کرا دوں۔ اب برسات شروع ہو چکی ہے۔ بھلا پانی کے دنوں میں کہاں کی تعمیر۔"

"خیر اگر آج وہ نہ بھی آئیں تو کل میں ان سے مل کر کہہ دوں گا کہ کچھ ہفتے وہ تمہارے ہاں گزاریں۔" رضا بولے۔ "دراصل بات یہ ہے کہ وہ گھر والوں پر بار بننا نہیں چاہتے۔ اور جانتے ہیں کہ تم ان سے طعام کے مصارف لینا پسند نہ کرو گے۔"

یقیناً نہیں لوں گا۔" امیر احمد نے کہا۔"بیکار کا تکلف کرتے ہیں
گھر میں جو کچھ پکتا ہے اس میں وہ بھی شریک ہو جائیں گے۔ میں تو
بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔ باہر کا بڑا کمرہ ان کے لئے ٹھیک بھی
کروا دیا تھا۔ ابّا کے بعد کم سے کم انتخار ہی کے دم قدم سے آباد ہو جائے۔
"ہو جائے گا۔" رضا نے لاپروائی سے کہا۔"میں ان سے پھر کہوں گا۔"
باہر سے کسی نے آواز دی۔"صاحب آکے یہ پلیٹیں لے جایئے۔"
"کہاں ہے شبیر؟" امیر احمد نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔
"کراکری لے آئے۔ خالہ بیگم کو لینے گیا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔"
شائستہ نے کہا۔
"اچھا میں لئے آتا ہوں۔" رضا اٹھنے لگے مگر وہیں واپس کرسی
میں ڈھکیل کے زوبی بولی۔
"ہائے ہائے۔ سالگرہ کے بچے کے باواجان کہیں ایسے کام کرتے
ہیں۔ عزت کی کرکری ہوتی ہے۔ آپ تشریف رکھئے۔ پلیٹیں ہی تو
لانا ہیں نا۔ میں لاتی ہوں۔"
"باہر مرد ہوں گے" اماں نے کہا۔
"باورچی بھی کہیں ایسے مرد ہوتے ہیں۔ جن سے پردہ کیا جائے۔"
زوبی بولی۔ اور نفیس حباب سا دوپٹہ بیدردی سے کمر سے کس کر باہر بھاگ گئی۔
"شاید کبھی آدمی نہ بنے" اماں نے ٹھنڈی سانس لی۔
زوبی نے بڑا پردہ سر کایا۔ اور ڈیوڑھی میں چھلانگ لگائی۔
وہاں جانے کیا کچھ بکھرا پڑا تھا۔ عام راستہ ادھر سے نہیں تھا۔ ہندا!
اماں نے پانی بوند کے ڈر سے سوچا تھا کہ ادھر ہی کھانا بکوالیں۔ اب

باورچی صاحب نے ٹوکریاں، باسکٹ، کچرہ گھورا سب ادھر ادھر پھیلا رکھا تھا۔ وہ ان سے بچنے کے لئے جو لڑکھڑائی تو گرنے سے پہلے کسی نے اسے تھام کر سیدھا کر دیا۔ جھٹکے سے اپنے بازو چھڑاتی ہوئی وہ ڈپٹ کر اس آدمی سے بولی۔

"اوئی۔ کہاں ہیں پلیٹیں!" اور حیرت سے اسے اوپر سے نیچے تک گھورا۔ پھر منھ بنا کر بولی۔ "دکان میں کام کرنے والے بھی شاندار کپڑے پہن کر صاحب بن جاتے ہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ نوکر ہیں۔" اسے ان کے بے داغ شاندار ملبوس پر حیرت تھی۔

"کیا فرمایا آپ نے؟" ایک دلکش متبسم آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "نوکر کیسا۔ اور پلیٹیں کہاں کی؟"

"کراکری کی پلیٹیں؟" زوبی نے رعب سے کہا۔ "ابھی آپ نے جو آواز دی تھی۔ کہاں ہیں رکابیاں!"

"رکابیاں؟" انھوں نے حیرت سے کہا۔ "قسم لے لیجئے ہیں تو جانتا بھی نہیں۔"

"پھر——؟" اب کی وہ باورچی پر امڈ گئی۔

"بی بی وہ کیا ادھر ٹوکرے میں رکھی ہیں۔" باورچی بولا۔ "مگر ٹوکرا بہت وزنی ہے۔ آپ سے اٹھے گا نہیں۔ کیا آپ رکابیاں ہی لینے آئی ہیں؟"

"تو پھر تم ہی یہ ٹوکرا اندر لے چلو۔" زوبی اس شاندار لباس والے سے بولی۔ "مجھ سے تو اٹھے گا نہیں۔"

"ارے بی بی سنئے تو؟" باورچی جو تھکا ہارا سا دیوار سے ٹیک

لگائے بیٹھا تھا۔ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ صاحب ـــ؟"
اس کی گھگھیائی ہوئی بات ادھوری رہ گئی۔ کراکری والے نے ایک عجیب سے تبسم کے ساتھ اس شعلۂ جوالہ پر نظریں دوڑائیں۔ جو کاسنی کڑھے ہوئے نیچے جیسے کرتے اور ہم رنگ پاجامے کرن لگی اوڑھنی میں قیامت لگ رہی تھی۔ جس کے گھونگھر کالے بالوں کی ایک موٹی سی لٹ عقب سے بغاوت کرکے آگے آ گئی تھی اور اس کے گھٹنے کو چھو رہی تھی۔

پھر اس نے جھک کر ٹوکرا اٹھا لیا۔ اور پوچھا۔ "اندر رکھنا ہے اسے۔؟"

"اور نہیں تو کیا۔ میرے سر پر پٹخنا ہے؟" زدبی نے کہا۔
"سر پر پٹخنے میں خطرہ ہے"۔ اس گستاخ نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ "کانچ کی رکابیاں ٹوٹ پھوٹ کے برابر ہو جائیں گی۔ اچھا چلیئے"۔
زدبی کو غصہ تو بہت آیا تھا۔ مگر ایک پھنکار پر اکتفا کر کے وہ آگے آگے ہولی۔ جھپٹ کر پردہ ہٹایا اور اشارے سے بولی۔
"ادھر دالان میں"۔ خود پیچھے کھڑی رہی۔
مگر جیسے ہی ٹوکرا اٹھاتے ہوئے شخص نے صحن میں قدم رکھا۔ رضا نے۔ امیر احمد نے اور ساتھ ہی شائستہ نے حیرت کی ایک مشترکہ چیخ ماری۔

"افتخار۔ یہ تم کیا اٹھائے ہوئے ہو۔ ہر تینوں کا ٹوکرہ"۔ پھر ان سب کا قہقہہ اس طرح وہاں گونجا کہ زدبی کے بدن سے جان ہی سرک گئی۔ جو کبھی کسی سے ڈرتی نہ تھی۔ سہم کر رہ گئی۔

"اماں یہ کیا؟" رضا کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی تیز ملی اور نادم سی مسکراہٹ کے ساتھ شائستہ نے کہا۔ "کچھ کھسیانی سی زوبی کی بچی نے سنے کیا ہے۔ اور منع کرتے کرتے بھاگی تھی اور آپ سے یہ زحمت لے لی" جھپٹ کر برتنوں کا ٹوکرہ انھوں نے لے کر ایک طرف رکھ دیا۔

"مگر یار تم اس پرانے راستے سے کیوں آئے تھے؟" رضا نے کہا اور ہاتھ تھام کر سب کے پاس لے آئے۔ "بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ اور ہماری تو آنکھیں ہی اس بڑے در پر لگی تھیں۔ تم بھی دیر ہی کر کے آئے ہو۔

افتخار نے مڑ کر اپنی اس صدا بہار مسکراہٹ سے زوبی کو دیکھا جو خجل اور کھسیانی سی بت بنی کھڑی تھی۔ پھر بولے۔ "بھائی مجھے کیا پتہ تھا کہ تمہارے گھر کا نیا دروازہ کون سا ہے۔ اور پرانا کون سا۔ اس دروازے پر شبیر منزل لکھا تھا۔ میں اسی دروازے سے اندر چلا آیا۔ مگر سچ مانو کر برا گری والا بن کر نہیں۔"

"ہاں بھیا۔ وہ نیم پلیٹ ہم نے اتاری نہیں۔" شائستہ نے جواب دیا۔ "ابا کے بعد ان کے نام کو تو گھر سے وابستہ رہنا ہی چاہیئے نا۔ اس لئے۔ ادھر بڑے صحن کی طرف دوسرا راستہ ہے۔ اب تو سب ادھر ہی سے آتے جاتے ہیں۔

امیر احمد نے کہا۔ "چلو افتخار پہلے اماں سے ملو۔ ہم نے تمہارا ذکر ان سے کیا تھا وہ بھی تمہارا انتظار کر رہی تھیں۔

"ضرور ضرور!" افتخار اٹھ کھڑے ہوئے۔ "لیکن وہاں ان کے پاس دوسری خواتین بھی ہوں گی۔ بھائی مجھے شرم بہت آتی ہے!"

"اماں کو میں شائستہ نشین کے پاس لئے آتا ہوں۔" امیر احمد یہ کہہ کر چلے گئے۔ شائستہ نے جو زوبی کو گھورا تو وہ جو ابھی تک سہمی کھڑی تھی۔ اور اس عرصے میں سنبھل چکی تھی۔ خاصے گستاخ اور بے ادب لہجے میں وہ بولی "کوئی الہام ہوا تھا مجھے کہ یہ افتخار ہیں۔ میں سمجھی بربتنوں والا ہوگا۔ کھڑے کیوں تھے باورچیوں کے پاس۔ ان کے ماتھے پہ ان کا نام لکھا ہوتا تو میں ادب سے ہاتھوں ہاتھ اندر لے آتی۔

"بدتمیز کہیں کی!" شائستہ نے خاصی شرمندگی محسوس کی۔ اس جانور کو اماں آدمی نہ بنا سکیں۔ افتخار نے بے حد سنجیدگی سے شائستہ کی طرف دیکھا۔

"میری چھوٹی بہن ہے۔ زبیدہ" وہ خجالت سے بولیں۔ "ذرا تیز مزاج ہے آپ کچھ خیال نہ کیجئے گا۔

"میں بالکل خیال نہ کروں گا۔" بڑے خلوص سے افتخار نے جواب دیا "مگر میں حیران ہوں۔ آپ جیسی میٹھی میٹھی خاتون کی یہ مرچ صفت بہن۔ بہت فرق ہے۔"

"آؤ بھائی" امیر احمد نے آواز دی۔

"میں ابھی آیا۔" افتخار نے کہا۔ اور ادھر لپک گئے۔ امیر احمد کے پاس ایک پُروقار اور بے حد سنجیدہ سی خاتون سفید ملبوس میں کھڑی تھیں۔ نرم دل۔ خلوص و محبت جن کے چہرے سے برس رہا تھا۔

"میری والدہ!" امیر احمد نے کہا۔ "اور اماں یہ افتخار احمد ہیں۔ میرے اور رضا کے دوست۔ اور ــــــ!"

افتخار نے بے حد ادب سے جھک کر اماں کو سلام کیا۔ اور خاموش کھڑے رہے۔

"اماں! یہ اپنا مقالہ یہاں یونیورسٹی میں داخل کرنے آئے ہیں"۔ امیر احمد نے کہا۔ "ان کے والدین اور چھوٹی بہن نظام آباد کے ایک تعلقہ میں رہتے ہیں۔ وہاں ان کا موروثی گھر اور کھیت باغات وغیرہ ہیں۔ یہاں اس شہر میں ان کا کوئی عزیز قریب نہیں۔ اس لئے اپنے کام کی مدت تک یہ کسی ہوٹل یا بورڈنگ میں قیام کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس صورت میں جبکہ ہم اور رضا ان کے پرانے دوست یہاں موجود ہیں تو ہم نے ان سے یہی کہا کہ بورڈنگ یا ہوٹل کا قیام تعلیمی مصروفیت کے لئے مناسب نہیں ہے۔ کیا حرج ہے کہ یہ چھ سات ہفتے میرے یہاں گزاریں۔ یہ تو آنے پر راضی نہیں تھے۔ میں تو زبردستی لایا ہوں"۔

اماں نے ایک مسکراتی ہوئی نگاہ افتخار پر ڈالی۔ تو وہ جلدی سے بولے۔ "دراصل انھوں نے مجھ سے کہا ہی نہیں کہ ایک محبت کرنے والی ماں میرے یہاں بھی موجود ہے۔ ورنہ میں ان کی زبردستی کے باوجود خود آ چلا آتا"۔

"میاں جب تم رضا اور احمد کے دوست ہو تو پھر جیسے وہ میرے بچے ہیں ویسے ہی تم بھی ہو"۔ اماں نے کہا۔ "مجھے تو خوشی ہوگی۔ اگر تم ہمارے ہاں رہو گے۔ امیر نے جب کہا تھا کہ تم آنے والے ہو تو ہم نے باہر کا کمرہ تمھارے لئے ٹھیک کروا دیا تھا۔ تمھارے آرام کی ہر چیز وہاں موجود ہے۔ پھر بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو لڑکے سے کہلوا دینا۔ تکلّف نہ کرنا"۔

"تکلف تو میں کرتا ہی نہیں اماں"۔ افتخار نے کہا۔ "اب دیکھئے صبح کو صرف تین عدد سلائس کھا کے چائے پی تھی۔ دوپہر کو کچھ کھانے کا

موقعہ ہی نہیں ملا۔ اس وقت مارے بھوک کے یہ حال ہے کہ کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ گرا اگرا پڑتا ہوں۔ اتنی دیر تک جو محترمہ.. زبیدہ نے کراکری والا سیچ کے بھانت بھانت کی خوشبوؤں کے درمیان کھڑا رکھا ہے نا تو اور عبرت ناک حالت ہوگئی ہے بیچاری۔

امیر احمد ہنس رہے تھے۔ اماں نے جلدی سے کہا۔ بیٹا یہاں تو کھانے میں ابھی بڑی دیر ہوگی۔ تم اپنے کمرے میں جا کے منہ ہاتھ.. دھو! میں ابھی کھانا بھجواتی ہوں۔ پھر جب بچے کو پھول وغیرہ.. نہائے جائیں گے تو میں بلوا بھیجوں گی۔"

"اماں ایسا بھی کیا کہ کچھ دیر صبر نہیں کر سکتے۔" امیر احمد نے آنکھیں نکالیں۔ "زمانہ ہو گیا ساتھ کھائے ہوئے۔ گھنٹہ بھر اور صبر کرو۔ ہم سب ساتھ کھائیں گے۔ مگر بات یہ ہے نا کہ تم ازل کے مر بھوکے ہو ہمیشہ بھوک بھوک چلاتے ہو۔ اماں کھانا وانا مت بھیجنے گا۔ میں ابھی کھانے نہیں دوں گا۔" وہ افتخار کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ میں گھسیٹ لائے "چلو بیٹھو شرافت سے۔ باتیں کریں بہل جائے گی تمہاری معصوم بھوک لاحول ولا قوۃ ـ!" انھوں نے افتخار کو کرسی پر دھکیل دیا۔

"ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں صورت پر ـ!" رضا نے قہقہہ لگا کر پوچھا "آندھیاں چل رہی ہیں۔ وہ ہوائیاں نہیں ہیں۔" افتخار نے جواب دیا۔ "دراصل بھوک ـ"

"خاموش رہو۔" رضا جھلا گئے۔ "یہ عمر آئی ہے۔ بیٹھو بن دلہا بچے ہو بھوکے تو ہم بھی ہیں مگر صبر ایوبی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ منہ میں رال گھونٹ رہے ہیں۔ زبان پر کھانے کا نام بھی نہیں لاتے۔"

"کیسے کیسے کنگلے فقیر آج میرے گھر میں جمع ہو گئے ہیں"۔ امیر احمد نے کہا۔ "صرف موسیقی ہی پر نیت خراب ہو رہی ہے مشکل ہے کہ آج کسی کو کھانا ہضم ہو سکے"۔

دفعتہً چلتے ہوئے ایک فلمی گانے کی لہران تک آئی۔ ساتھ میں میرے قہقہوں کی بوچھار۔ پہلے تالیوں کے ساتھ تیرہ کے عدد تک گنتی پھر۔ دن گن گن کے انتظار آجا پیا آئی بہار"۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور ہنسنے لگے۔ افتخار نے کہا۔ "آج کل ہر طرف اسی گانے کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ کس قدر الرجک ہوں اس گنتی سے۔ ضبط کرتا ہوں ادھر دھیان ہٹاتا ہوں مگر سچ کہتا ہوں کہ کھایا پیا نکل جائے۔ کیا عجیب ہو گیا ہے فلمی شاعری کا معیار۔ موسیقی کو روح کی غذا کہا گیا ہے لیکن اگر روح کی غذا یہی موسیقی یہی شاعری ہے تو بھائی اس سے تو روح بیچاری کا ہاضمہ خراب ہو جائے گا۔

"نئی نا سمجھ نسل کا ذہنی معیار بھی پست ہوتا جا رہا ہے۔ اخلاق پر الگ ناگوار اثر پڑتا ہے۔ لیکن بس اگر یہ وبا ہی ہے تو پھر اس سے بچنا نہایت مشکل ہے"۔ رضا نے کہا۔

"تم تو سوز و ساز کے اس قدر شوقین تھے"۔ امیر احمد نے کہا۔

"اب نہیں رہا"۔ افتخار بولے۔ "پچھلے دنوں ایک محفل اٹینڈ کرنے کا موقع ملا تھا۔ بڑے بڑے پڑھے لکھے محفل میں موجود تھے قوالی ہو رہی تھی۔ قوال صاحب علامہ اقبال کی نظم گا رہے تھے۔

"کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں"۔

ان کے سامنے پرچہ بکھار کھا تھا۔ شاید مجاز کا میم کچھ گھسیٹا ہوا تھا کہ قوال صاحب نے اسے مجاز کی بجائے حجاز پڑھ لیا۔ اور اسی کو تکرار کے ساتھ جھوم جھوم کر گانے لگے۔ محفل میں تعلیم یافتہ حضرات بھی موجود تھے لیکن یقین کرو کہ کسی نے ٹوکا نہیں۔ سب ہی جھوم۔۔ رہے تھے۔

"تم نے بھی غلطی پر نہیں ٹوکا۔" رضا نے کہا۔

"میں اٹھ کر چلا آیا۔ افتخار نے کہا۔"

وہاں شہیر آیا۔ "چلیے باہر کھانا لگا دیا ہے۔ اماں کہہ رہی ہیں کہ افتخار بھائی تکلف نہ کریں۔" اس نے تیر رفتار سے نو وارد کو افتخار ہی سمجھ کر دیکھا۔ اور سب سے پہلے وہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بیٹے اماں سے کہنا۔ باہر اگر مہمانوں کے ساتھ اچھی طرح نہ کھا سکا تو اندر جا کے ایک بار پھر کھاؤں گا۔ شکریہ!" شہیر ہنستا ہوا چلا گیا۔

"ارے ہاں رضا!" افتخار نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "میں اتنا بھلکڑ ہوں۔ سب سے پہلے تو مجھے بچہ کی سالگرہ کی مبارکباد دینی چاہیئے تھی۔ خیر اب قبول کرو۔ میری دعا ہے کہ وہ ایسی بے شمار سالگرہیں منائے۔ ہمیشہ خوش اور صحت مند رہے خدا اسے صاحب نصیب کرے۔"

"شکریہ میرے دوست شکریہ۔" رضا نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ شہیر نے ایک بار اور آواز دی اور رضا امیر اور افتخار کے ساتھ باہر کی جانب مڑ گئے۔

بارش کے دن تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں پانی آ نہ لے۔ کھانے

سے جلدی سے فراغت ہو گئی۔ پھر ننھے نے اپنے چاہنے والوں کے درمیان اپنی سالگرہ کا خوشنما ایک منزلہ کیک کاٹا۔ تحفے بٹورے دعائیں سمیٹیں۔ پھر شہیر پھولوں میں لدے پھندے بچے کو باہر لے آیا۔ مہمانوں نے بھی اسے تحائف دیئے۔ اور افتخار نے اسے شہیر کی گود سے لے لیا۔

مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔ یہ کتنا پیارا ہے۔ انھوں نے اس کے نرم ریشمی گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اور پھر جیب سے ایک گلابی لفافہ نکال کر اس کی ننھی سی مٹھی میں دبا دیا۔

"سنو افتخار۔ اس تکلف کی ضرورت نہیں۔" رضا نے جلدی سے کہا۔

"آپ خاموش رہئے۔" ڈانٹ کر افتخار نے کہا۔ "اس سے میرا دہرا رشتہ ہے۔ میں اس کا چچا بھی ہوں اور ماموں بھی۔ اس کے اور میرے معاملے میں کسی دوسرے کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔" اور پھر منّے کی پیشانی چوم کر اسے شہیر کی گود میں دے دیا۔

واقعی کسی سلانت کی آمدنی کا ذریعہ پیدا کرنا ہو تو کھڑے گھاٹ سے سالگرہ کرے۔" امیر احمد نے سر ہلا کر کہا۔ "اب اپنے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔"

رفتہ رفتہ یہ تقریب اختتام کو پہونچی۔ مہمان سدھارے۔ بادل جو اماں کی دعاؤں سے منتشر ہو گئے تھے کہ ان کی محفل بے کیف نہ ہو جائے۔ تقریب پر پانی پھر جائے۔ ایک بار پھر اکٹھا ہونے لگے۔ پھوار پڑنے لگی۔ ہوائیں چلیں اور بادلوں نے گرج کر برسنے

کا اعلان کیا۔ دلکش و مترنم رم جھم شروع ہو گئی۔

شائستہ نے سب کو بڑے کمرے میں بلا لیا۔

یہاں فضا نہایت خوشگوار تھی۔ ایک گوشے میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ باہر بارش کا جل ترنگ بج رہا تھا۔ شائستہ اور امیر احمد کی بیوی عذرا ایک طرف بڑی میز پر برقی چولھا رکھے چائے بنانے میں مصروف تھیں۔ عذرا جو پہلی بار افتخار کے سامنے نکلی تھیں بہت ہی محجوب سی تھیں۔ انھوں نے آنچل میں خود کو چھپا رکھا تھا۔ افتخار نے بھی ان کی طرف پیٹھ کر لی تھی۔ اور اماں سے باتوں میں مصروف تھے۔ رہ رہ کر ان کی نگاہیں بھٹک کر زوبی پر لگ جاتیں۔ جو اپنے قیمتی لباس کی قطعی پروا نہ کر کے بڑے ڈھنگی سی پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ننھا بھی بیٹھا تھا۔ وہ تحائف کے سارے بنڈل سمیٹ لائی تھی۔ اور اب کسی کی طرف توجہ دئیے بغیر نہایت بے دردی سے پیکٹوں پر منڈھے سنہرے گلابی اور سرخ ریپر نوچ نوچ کر پیکٹوں کے اندر کی چیزیں نکال کر فرش پر ڈھیر کرتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کے تبصرے بھی جاری تھے۔

"کون سے جانے یہ موت کھایا۔ ہنھ! ارے کہیں بچّے کو چاندی کا کٹورہ دیا جاتا ہے۔ جیسے اسے کوئی گلاس ہی نصیب نہیں ہو پیاسا مر رہا ہے۔ دیتے تو کوئی اچھا سا کھلونا دیتے۔ یہ کیا چیز نکلی ہے۔ ربر کا لجلجا سانپ سا۔ آہا۔ اس میں ہوا بھر کر حوض سا بناتے ہیں۔ اور پانی بھر کے بچّے کو بٹھا لیتے ہیں۔ تو جی کہیں ڈوب اوب جائے تو اماں باوا کی کوکھ میں آگ لگ جائے نا۔"

کیا بک رہی ہے۔" شائستہ نے ڈانٹا۔ "خوب زبان لمبی ہو گئی ہے۔ اب یہ بڑے بڑے لفظ تجھے کس نے سکھائے ہیں عجیب وحشی لڑکی ہے۔ نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ۔ جو کچھ سمجھ میں آیا بس منہ کے خندق سے باہر۔ اب نہ سنوں میں تمھاری آواز سمجھیں"

"تجھے بھی نہ دیکھوں کیا۔" وہ چیخی۔

"خاموشی سے دیکھو۔" امیر احمد نے کہا۔

"سبھی ڈانٹتے ہیں۔" اس نے منہ پھلا لیا۔ "اماں بھی کچھ نہیں بولتیں میری تو تقدیر ہی خراب ہے۔ اللہ مجھے اٹھا کیوں نہیں لیتا۔ قبر ہی کا پیٹ بھرے۔"

"چپ رہ منحوس!" شائستہ بگڑیں۔ "یہ کیا آدھی رات کو کوسنے دے رہی ہے۔"

"خود کو دے رہی ہوں کسی دوسرے کو نہیں۔" وہ بولی اور تحفوں کے ڈھیر کو دور ڈھکیل دیا۔ امیر احمد نے ٹھنڈی سانس لی۔ حد تھی واقعی، سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی اور اس کے گن ایسے۔ زبان کا یہ حال۔ جہالت اتنی فلک شگاف۔ وہ پریشان تھے۔ آخر انجام کیا ہوگا اس کا۔؟

کھنکھار کر انھوں نے کہا۔ "اچھا اب اٹھو اور چائے بناؤ۔ دیکھ رہی ہو۔ تمھاری بھابی اور اپیا بنا رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں اٹھ جاؤ اب"

"اچھا بھیا!" جیسے وہ دانت پیس کر اٹھی تھی۔ ایک قہر بھری نظر امیر احمد اور دوسری اس سے زیادہ خونخوار افتخار پر ڈالی اور شائستہ عذرا کے پاس جاکر جلے کٹے لہجے میں بولی۔ "جائیے

یہاں سے۔ آپ لوگوں کو کام کرتے دیکھ کر آپ کے میاؤں کے کلیجے ہلتے پڑ رہے ہیں۔ جا کے آرام سے بیٹھ جائیے۔ ابھی یہ لونڈی زندہ ہے تو آپ لوگ ہاتھ پاؤں کیوں ہلا رہی ہیں؟"

"ہاں اب تم ہی ہلاؤ ہاتھ پاؤں۔" عذرا نے کہا۔ "ہم آرام سے بیٹھتے ہیں۔ چلو شائستہ بنا نے دو اسے چائے۔"

دونوں ایک دیوان پر جا بیٹھیں۔ زوبی بیگم نے ڈیوٹی سنبھالی۔ مگر کس طرح کہ کمرے میں بھونچال سا آگیا۔ کبھی وہ برتن پٹختیں۔ کبھی ٹرے میں پیالیاں اس طرح رکھتیں کہ ان کی جان پر بن جاتی کبھی چمچوں کے گرنے کا چھناکا ہوتا۔ خدا خدا کر کے چائے بنی اور انھوں نے چائے کے سیٹ کے بجائے پیالیوں ہی میں بنی بنائی چائے لا کے بڑی میز پر دھر دی۔ خود بھولی سوجی ــــ الگ جا بیٹھیں۔ کسی نے کچھ نہ کہا۔ مگر ایک ایک سانس لے کر پیالی اٹھائی۔

افتخار بڑے شوق اور دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے لئے وہ ایک عجیب چیز تھی۔ جیسے ایک طلسماتی وجود ہو۔

خوبصورت قامت!

گھٹاؤں کے سے سیاہ اور بے حد لمبے بال!

گلابی گلابی رنگت۔

موٹی موٹی آنکھیں، سیاہ اور خمیدہ پلکوں سے آراستہ،

باریک لب۔ موتی کے سے جمے ہوئے چمکیلے دانت،

تیز اور سُریلی آواز، وہ سلگتا ہوا لہجہ۔

بے باکی۔ دلیری۔ نڈرپن۔

نہ کسی سے مرعوب نہ متاثر۔

زندگی بھر میں پہلی بار ایسی لڑکی دیکھی تھی۔ ورنہ ان کا سابقہ کالج اور یونیورسٹی میں سینکڑوں لڑکیوں سے پڑ چکا تھا۔ ان کے خاندان میں بھی کتنی ساری لڑکیاں تھیں۔ پھر ان کی اپنی بہن تھی۔ اسی عمر کی مگر چھوئی موئی سی۔ وہ تو باپ اور بڑے بھائیوں کے سامنے منہ بھی نہیں کھولتی تھی۔ افتخار کو تو یاد بھی نہ تھا کہ اس کی آواز کیسی تھی۔ دوسری ان کی منگیتر تھی اس کا بھی یہی حال تھا کہ نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے شرمیلی، کم سخن، بے زبان سی۔ حالانکہ ان کی حقیقی خالہ زاد بہن تھی لیکن نہ منگنی سے پہلے نہ بعد کو وہ تو ان کے سامنے نکلتی ہی نہ تھی۔ ان لڑکیوں کے علاوہ ان کی امی تھیں۔ چچی خالہ اور پھوپھی بھی تو تھیں مگر سب کی سب سیدھی سادی بھولی بھالی بے زبان سی مخلوق۔ ان کا تجربہ بس ایسی عورتوں تک محدود تھا۔ جو اسم بامسمیٰ تھیں۔ عورت بن کر پیدا ہوئی تھیں اور عورت ہی رہ کر جی رہی تھیں انھوں نے اپنے باپ چچا اور ماموں وغیرہ کو جابر و سنگدل حاکموں کے روپ میں.. بے شک دیکھا تھا لیکن عورتوں کو نہیں۔ وہ تو ماتھے تک آنچل ڈال کر مردوں کے سامنے آتی تھیں۔ ان کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر بھی ان کی مجال نہ تھی کہ زبان ہلا سکتیں۔ جواب دینا مقابلے پر آنا تو درکنار لیکن یہ لڑکی تھی ان کے اب تک کے تجربے کا مذاق اڑاتی ہوئی۔ عجیب نمونہ، صورت میں بے مثال، چاندنی کی سی حسین، کلی کی سی نازک اور ایلوے کی کڑوی۔ انھیں یک لخت اس سے بے انتہا دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ان سے بھی تو اس نے برتن اٹھوائے تھے!

اب کم سے کم دو ڈھائی مہینے انھیں اسی گھر میں رہنا تھا۔ ان محترمہ کا شب و روز کا ساتھ رہے گا۔ دیکھئے کیا حشر ہونا ہے انھیں ہنسی آنے لگی۔

گھڑی نے گیارہ بجائے بارش کا زور بڑھ گیا تھا۔

رضا نے ایک ہلکی سی انگڑائی لی اور بولے۔ "آج تو بہت تھک گئے۔ اب سونے چل سکے؟"

"ہاں۔ ہاں ہم بھی چلتے ہیں!" امیر احمد بھی کھڑے ہو گئے۔ اور اماں سے بولے۔ "آپ بھی آرام کیجئے۔ میں سمجھتا ہوں فجر کے وقت سے ابھی تک آپ مصروف ہی رہی ہیں۔ اماں آپ کیلئے آرام بہت ضروری ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر لیٹ جایا کیجئے۔

اماں نے گہری یا یوں سی سانس لے کر کہا۔ "آرام کے سوا میں کرتی کیا ہوں بیٹا۔ آج تو جان بوجھ کر اپنے آپ کو مصروف رکھا تھا۔ اب کل تم چلے جاؤ گے۔ شائستہ اپنے گھر جائے گی۔ اپنی بیمار بہن کی مزاج پرسی کے لئے عذرا کا جانا بھی ضروری ہے۔ چلو۔ گھر خالی ہو گیا۔ ڈھنڈار گھر میں میں اکیلی رہ جاؤں گی اور زوبی بارجو اس سی ڈاؤں ڈاؤں گھوما کرے گی۔ پھر آرام کے سوا کام ہی کیا ہوگا میرا!"

"اماں دیکھئے نا"۔ امیر احمد بے بسی سے بولے۔ "میری سروس نئی نئی ہے سپر وائزر صاحب کے ساتھ میرا جانا تو بہت ضروری ہے۔ شائستہ کا بھی گھر بار گرہستی ہے اماں۔ اور شبیر کالج۔۔ چھوڑ کے گھر پر رہ نہیں سکتا۔ اگر عذرا کی بہن اتنی خطرناک بیمار نہ ہوتیں تو میں انھیں جانے کی اجازت نہ دیتا۔ وہ بھی مجبور ہیں اس لئے۔"

"ہاں بیٹا۔ یہ تو ایک بات یونہی میں نے کہہ دی تھی۔" اماں بولیں "میں تو عادی ہو چکی ہوں تنہائی کی۔ میرا کہنا یہ تھا کہ اس چہل پہل کے بعد اکیلاپن ذرا کھلتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔"
"لیکن اکیلے پن کو آپ محسوس نہ کیجئے۔" دفعتاً افتخار نے دخل دیا۔ "ان سب کو جانے دیجئے اب میں آ گیا ہوں۔ آپ کے پاس رہوں گا۔ باتیں کیا کروں گا۔ یونیورسٹی میں میرا کام بس صبح دس بجے سے تین بجے تک رہے گا۔ پھر سارا وقت میرا ہے۔ آپ کا ہے۔ آپ کو میں محسوس ہی نہیں ہونے دوں گا کہ آپ تنہا ہیں۔ کیا میں امیر اور رضا سے کچھ کم ہوں اماں۔"
"نہیں بیٹے نہیں۔" اماں ہنس دیں۔ "جیسے وہ ویسے تم۔ چلو اچھا اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ دراصل بیٹا جب سے مجھ پر ڈیپریشن کے دورے پڑنے لگے ہیں تبھی سے کچھ خوف سا ہونے لگا ہے۔ کہ کوئی نہ ہو میرے پاس اور دورہ پڑ جائے تو کسے پکاروں گی۔ کیا کروں گی؟"۔
"اماں یہ ڈیپریشن بھی فکروں، خیالوں اور اکیلے پن کا ہے۔" افتخار نے کہا۔ "آپ ساری فکروں اور پریشانیوں کا غبار ذہن پر سے ہٹا کر ہلکی پھلکی ہو کر خوش رہنے کی کوشش کریں گی تو یہ ڈیپریشن وغیرہ سب غائب ہو جائے گا۔ آدمی کو واقعات عالم سے متاثر ضرور ہونا چاہیئے لیکن اتنا بھی نہیں کہ اس سے صحت متاثر ہو جائے۔ یا قویٰ پر اثر پڑے۔ زندگی ہمارے لئے خداوند کریم کا عطیہ ہے۔ اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔
"اچھا چلئے۔ تقریر بہت ہو لی۔" اچانک ایک طرف سے زوبی کی

تبھی آواز سنائی دی۔" آپ جائیے اپنے کمرے میں۔ اماں کو بھی جانے دیجئے۔ اتنی رات ہو گئی ہے۔"

انتخار چونک کر مڑے۔ اس کے ٹوکنے سے خاصی خجالت محسوس کی۔ اوروں نے بھی بڑی ناگواری سے اس کی بات برداشت کی تھی۔ شائستہ اسے سرزنش کرنے کے لئے الفاظ منھ میں گھما ہی رہی تھیں کہ زیبی اماں کا ہاتھ تھام کر کمرے سے چلی گئی۔

صبح کی غبار آلود فضا سخت سوگوار تھی۔ باہر ہوائیں شور مچا رہی تھیں۔ آسمان کی خوشنما نیلاہٹوں پر بادل محیط تھے۔ دھوپ غائب تھی۔ ہر چیز بھیگی بھیگی' ہر طرف نمی' ایک بیزار کن خنکی عجیب سا موسم تھا۔ کہ کسی طرح دل بہل ہی نہیں رہا تھا۔ کتنی تنہائی تھی۔ سناٹا سا۔ سناٹا جو بس روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اور وہیں منجمد ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگی کی ساری دلچسپیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ ان پر گہرا گہرا اندھیرا ڈال دیتا ہے۔ کہ پھر مسرت کی کوئی کرن اس کہرے سے گزر کر دل کی تاریکیوں کو روشن نہیں کر سکتی۔

ان کی تو سوچیں تک ٹھٹھر گئی تھیں۔ ایک احساس نے دماغ پر پنجے گاڑ دئے تھے۔ ارد گرد فائل اور رجسٹر کے کاغذات بکھرے تھے۔ ان کے سارے اوراق بے ترتیب ہو چکے تھے لیکن انھیں ایک ترتیب سے رکھ کر ان پر نمبر لگانا بھی انتہا سے زیادہ ڈل کام لگ رہا

تھا۔ انھیں اپنی علمی استعداد پر فخر تھا۔ وہ علم دوست آدمی تھے۔ ان کی دوستی بس کتابیں ہی تھیں۔ کالج کی تنہائی کو انھوں نے کتابوں کی مدد سے انجمن میں بدل لیا تھا۔

اور یہ انقلاب آیا کیوں تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس بیزاری کی وجہ — وہ خط تو نہیں تھا جو امی نے لکھا تھا اور شبیر انھیں دے گیا تھا۔ ایک اجنبی نظر انھوں نے خط پر ڈالی جو پیپر ویٹ کے نیچے دبا ہوا ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے مسلسل پھڑپھڑا رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر انھوں نے خط ایک بار پھر ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس طرح اس پر نگاہیں دوڑائیں جیسے پہلی بار پڑھنے سے رہ گیا تھا۔ والدہ صاحبہ نے بہت طنزیہ تحریر میں لکھا تھا اور یہ ان کا انداز ہی تھا۔ تحریر، تقریر میں تلخی طنز اور درشتی موجود ہوتی۔ گھر کے دوسرے لوگ ان کی گفتگو کے انداز کے عادی ہو گئے تھے مگر افتخار کو ابھی تک اجنبی پن کا احساس ستاتا تھا۔

"لختِ جگر!"

اس لقب پر افتخار کا منہ بن گیا۔ بعد میں لکھا تھا۔

"وعدہ کیا تھا کہ جاتے ہی خط لکھ کر حالات و کوائف سے آگاہ کر دو گے مگر آج ایک ہفتہ ہو چکا تمھاری خیریت سے ہم لاعلم ہیں کہاں ہو۔ پتہ کیا ہے۔ کھانے پینے کا انتظام خاطر خواہ ہوا ہے کہ نہیں... سب کچھ تفصیلی طور پر لکھو۔ ممکن ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو آرام سے ہو۔ مگر ہم تو پریشان ہیں۔ امید ہے کہ آج کل میں تمھارا خط ملے گا۔

ایک ضروری بات یہ کہنی ہے کہ شام کو بہن آئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ سجاد میاں جلد ہی کسی ڈگری کے حصول کے لئے امریکہ جا رہے ہیں۔ زدر بہن کی شادی میں شرکت کر کے جائیں گے۔ لہٰذا تم لکھو کہ کب تک آ رہے ہو۔ انھیں ایک جواب دینا ضروری ہے۔ تاکہ ہم تاریخ لینے جا سکیں۔"

تمھارے ابا تمھیں دعا اور زینت سلام لکھاتی ہے

فقط تمھاری ماں!"

انھوں نے خط کے پرزے اڑا کر کھڑکی کے باہر پھینک دئے اور پٹ بند کر کے بستر پر آ لیٹے۔ عجیب سا ماحول تھا کہ کسی پہلو جی نہیں لگ رہا تھا۔ یا تو وہ خود ہی تبدیلی پسند تھے۔ ہموار زندگی اور یکسانیت انھیں بیزار کر دیتی تھی۔ اپنے مزاج سے وہ عاجز تھے نہ وہاں چین نہ یہاں قرار۔ جیسا کہ امیر احمد کی والدہ نے کہا تھا۔ اور دوسرے تیسرے دن ہی ان کے گھر میں سناٹوں کا راج ہو گیا۔ امیر احمد اپنی ڈیوٹی انجام دینے چلے گئے۔ رضا اور شائستہ بھی چل دئے۔ شبیر امتحانوں کے سامنے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ وہ بھی چلا گیا۔ اب گھر میں اماں اور وہ چلتا پھرتا شعلہ رہ گئے تھے۔ افتخار کو روزمرّہ کی زندگی میں تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ صبح وہی ناشتہ پہونچاتی تھیں۔ اور شام کو ان کی واپسی پر یہ دریافت کرنے کے لئے پھر آتی تھیں کہ انھیں کوئی ضرورت تو نہیں ہے۔ ایسے وقتوں میں زدبی اپنے چھوٹے سے باغیچے میں واہیات سی باغبانی کیا کرتی۔ وہ تو اس طرح صفت لڑکی سے بات کرتے ڈرنے لگے تھے کہیں تیز جواب نہ دے بیٹھے۔ مگر

ساری پریشانی یہی تو تھی کہ وہ زبان دراز لڑکی انھیں سخت ترین پسند بھی تھی۔ اور اس کے سامنے ان کی منگیتر کا چراغ گل بھی ہو گیا تھا۔

اماں بے چاری جو کئی برسوں سے ٹوٹی بکھری سی تھیں ان پر اعصابی کمزوری کے دورے پڑتے تھے۔ دو دو دن وہ بستر سنبھالے پڑی رہتیں۔ ایک دن یہی ہوا تھا۔ شام کو بہت تھکے ہارے سے افتخار یونیورسٹی سے واپس آئے تھے۔ کمرہ کھلا ہوا تھا۔ اور اندر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انھوں نے پردہ سرکایا اور دہلیز پر... ٹھٹھک گئے۔ زولی نے انھیں دیکھ لیا۔ وہی میز کرسیاں ترتیب سے دھر تج رہی تھی۔ افتخار کو دیکھ کر وہ جھجکی یا شرمائی نہیں بلکہ کمر کس کر انھیں گھورتی ہوئی بولی۔

"کچھ تو سلیقہ سیکھا ہوتا آپ نے۔ ہائے ہائے کیا اس طرح رہتے ہیں" اس نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر دونوں طرف ہاتھ پھیلا کر اشارے کیے۔ "استری کیے ہوئے اور میلے کپڑے آپس میں گڈمڈ کتابیں جیسے کشتی لڑ رہی ہیں۔ جھوٹی پیالیاں آپ نے میز پر رکھ چھوڑی تھیں۔ ان میں کالے کالے مکوڑے تیر رہے ہیں۔"

افتخار پٹ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اور دلچسپ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"مجھے بے حد افسوس ہے آپ کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی آئندہ یہ شکایت نہ ہونے دوں گا۔ خود ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر لیا کروں گا۔ اچھا اب آپ تشریف لے جائیے۔ باقی کام میں کر لے

لیتا ہوں۔"

"اب کیا کریں گے آپ باقی کے کام؟" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "سب کچھ تو میں نے کر لیا ہے۔ مگر سنئے جی مہمان صاحب! اگلی مرتبہ آپ یوں دھڑاک سے کمرے میں نہ گھس آیئے گا۔ باہر سے آواز دے کر آیئے گا۔"

"کیوں جی؟" بات کو طول دینے کے لئے افتخار نے جانی بوجھی حیرت سے کہا۔ "آواز دینے کی کیا ضرورت ہے۔ کمرہ میرا ہے۔ میں جب چاہوں آؤں جس طرح چاہوں آؤں۔ مجھے کون روک سکتا ہے؟"

"کوئی کیسی حالت میں ہو۔" اس نے قالین اٹھا کر افتخار کے منہ پر جھاڑ دیا۔

"اف۔ اف۔" افتخار نے کھانس کھنکھار کر ناک سے دھول نکالی "آپ مجھے کہہ رہی تھیں کہ سلیقہ نہیں سیکھا۔ مگر معاف کیجئے گا۔ سلیقہ کا فقدان تو آپ ہی میں بھی ہے۔ یہ مدتوں کا بچھا ہوا قالین جس میں منوں گرد جذب تھی آپ نے مجھ پر صاف کر دیا۔"

"دیکھ رہے تھے کہ میں قالین اٹھا رہی ہوں۔ الگ ہٹ جاتے۔ آپ کے منہ پر بھی آنکھیں ہی لگی ہیں۔ آلو نہیں ہیں۔"

"آپ کا کام ختم ہو چکا ہے تو براہ کرم باہر نکلئے۔"

"ٹھہر جائیے ذرا دیر۔ جھاڑو بھی مجھی کو دینی ہے۔ آج رمضانی حرامی کہیں اپنی بیت پر غارت ہو گیا ہے۔ خدا غارت کرے۔ ادھر ادھر کی شامتیں مجھ ہی پر امنڈ آئی ہیں۔" اس نے ایک خونخوار نگاہ افتخار پر ڈالی اور جھاڑو سنبھال کر فرش پر فراٹے بھرنے

لگی۔ ساری گرد افتخار ہی پر آرہی تھی۔ وہ پردہ برابر کر کے جلدی سے
سے پیچھے ہٹ گئے۔
پانچ منٹ بعد زوبی ٹوکری میں ڈھیروں کھودہ کپڑہ لئے اندر سے
نکلی۔ اور اس طرح جیسے وہ کچرے کی ٹوکری نہیں گلدستہ ہو۔ اسے
میز پر رکھ دیا اور اپنی سانسوں کو قابو میں رکھ کر بولی۔ "جائیے سب صاف
کر دیا۔ بتاتے جائیے۔ اب آپ کے لئے چائے بھیجوں یا ——!"
افتخار نے قریب سے بہت قریب سے اسے دیکھا۔ زیادہ قابل
دکھائی دی لمبی لمبی مڑی ہوئی پلکوں پر گرد کی ہلکی سی تہہ جمی تھی۔ اور
پلکوں کو خوشنمائی کی آخری حد تک نمایاں کر رہی تھی۔ پتلے پتلے گلابی۔۔
لب زیادہ غارت گیر ہو رہے تھے۔ ناک اور بالائی ہونٹ پر پسینے
کے قطرے مروارید کی طرح چمک رہے تھے۔
ان کی بے خبری اور بے خودی زوبی کے لئے سوچنے اور معنے پنہا
رکھ سمانے کی چیز ہی نہ تھی۔ جیسے وہ آنکھوں سے جھانکنے والے جذبوں
سے بالکل آشنا ہی نہ تھی۔ ویسی ہی مٹس بنی کھڑی رہی۔ اور ان کا
جواب سننے کے لئے ان کی طرف دیکھتی رہی جب افتخار نے دیر تک
کچھ نہ کہا۔ تو اسے غصہ آگیا۔ ایک جھٹکے سے ٹوکری اٹھائی اور بولی۔
"مزاج ہی نہیں ملتے۔ اے واہ۔ کتنی دیر سے ٹکٹکی لگی ہے میری
طرف۔ جواب دیتے زبان ہی نہیں کھلتی۔" یہ کہہ کر یہ جا۔ وہ جا۔
افتخار نے گہری سانس لی پھر اس نے اندر جا کر معلوم نہیں کیا کہا
تھا کہ اماں کے اسے ڈانٹنے پھٹکارنے کی آوازیں سنائی دی تھیں
بس کے بعد ملازم کی عدم موجودگی میں اماں نے ان کے ناشتے کھانے

کی ذمہ داری زوبی ہی کے سر ڈال دی۔! افتخار کو پتہ تھا کہ وہ ان کے کام کرتے تحت بیزاری محسوس کرتی تھی۔ ہمیشہ ہی جلی کٹی سناتی منہ بنائے رکھتی۔ تیوری پر بل پڑے رہتے۔

افتخار نے اماں سے شکایت کی تھی ہیں نے خوانخواہ زوبی کو زحمت دی ہے۔ انھیں غصہ بھی بہت آتا ہے۔ چائے کی پیالی میرے سر پر پٹخنے کے بجائے بدرجہ مجبوری میز پر پٹختی ہیں۔ آپ مجھے اجازت دیجئے۔ جب تک آپ کا ملازم نہیں آجاتا۔ میں باہر رہوں۔

"میاں اس کا کیا ––؟" اماں نے کہا۔ انھیں افتخار کی ذات پر بڑی مضبوطی تھی۔ صحن کی طرف کی درار پڑی دیوار اس برسات میں کچھ اور کھل چکی تھی۔ دو دفعہ راہ چلتی بکریاں بے دھڑک اندر آ کے صحن میں رکھے گملوں کے ہرے بھرے پھول پتے نوش فرما چکی تھیں۔ اور ایک مرتبہ ان کا کھوالا بھی اندر گھس آیا تھا۔ تب افتخار ہی نے انھیں اس طرح ڈانٹا تھا کہ وہ اپنی بکریوں کو اس راستے سے گزارتا ہی نہ تھا۔ اور اماں کو اطمینان تھا کہ جب تک افتخار ان کے ہاں رہیں گے انھیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ ورنہ وہ اکیلی اور جوان لڑکی کے ساتھ ڈھنڈار گھر میں رہتے خائف ہی رہتی تھیں۔ افتخار نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ کہ صبح یونیورسٹی جانے سے پہلے کچھ دیر اور واپسی پر شام تک اماں کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنے خاندان کا مکمل تعارف کرا دیا تھا۔ یہ البتہ نہیں کہا تھا کہ وہ اپنی حقیقی خالہ زاد بہن سے منسوب تھے۔

اماں نے زوبی کو یہ سزا دی تھی کہ افتخار کے کھانے پینے کے

ذمہ داری اسی کو سونپ دی تھی۔ اور افتخار سے بھی کہا تھا۔

"بیٹے اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے بہت احساس ہے افتخار میاں کہ اس کی اٹھان ایسی ہے کہ نہ نگوڑی کی زبان قابو میں نہ ہاتھ پاؤں۔ سب سے چھوٹی ہے۔ اسکے دادا کچھ زیادہ ہو گئے ہیں بس اسی سے بگڑ گئی ہے۔ میں سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی ہوں۔ میری تمام نصیحتیں اس کے سر پر سے گزر جاتی ہیں۔ اب تو اللہ ہی سے دعا ہے کہ اسے سمجھ دے تمیز دے یا پھر میری زندگی ہی میں یہ ختم ہو جائے۔ میں ایک دفعہ جی بھر کے رو لوں مرتے وقت کم سے کم یہ دکھ تو نہ رہے کہ بعد میں اس پر کیا گزرے کیا نہ گزرے۔ میری قبر میں بیٹھ تو سکے گی۔ اب تو روح بھٹکے گی اس کی فکر میں۔"

"اماں۔ اتنی مایوسی کی باتیں بھی کیا۔" افتخار نے کہا۔ اور ادھر ادھر دیکھا کہیں ان کی باتیں سن تو نہیں رہی کہ جھجک اٹھے۔ مگر وہ شاید اپنے کمرے میں تھی۔ انھوں نے آواز دبائی اور بولے۔

"آپ نے ان کی تعلیم پر توجہ نہیں دی۔ وہ بد شوق تھیں تو کہا جبراً بٹھائی جاتیں کسی استانی کے پاس کچھ نہ کچھ تو آہی جاتا۔ تعلیم کے فقدان نے مزاج میں کچھ زیادہ بے پروائی پیدا کر دی ہے۔ کسی سے بھی ذہنی ہم آہنگی نہیں۔ اس طرح تو آگے چل کر بڑا نقصان ہو گا۔"

"دیکھے تھے دو استاد!" اماں نے آہ بھر کر کہا۔ "سر پھوڑ پھوڑ کے بے چارے ہار گئے تو ہاتھ جوڑ کر چلے گئے۔ عربی پڑھانے کے

لئے ایک استانی آتی تھیں۔ وہ بھی اپنی بھیجہ خالی نہ کر سکیں۔ بے تنخواہ لئے چلی گئیں۔ کیا کروں میں۔ اسے خدا کے حوالے کر دیا ہے دماغ کا وہ پرزہ جو خراب ہے۔ خدا ہی درست کرے۔ انسانوں کے بس کی بات نہیں رہی۔"

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ" کھانس کر اور کچھ رکتے رکتے افتخار نے کہا۔ "آپ باامیر اگر اجازت دیں اور کوئی اعتراض نہ ہو تو میں کوشش کروں۔ شاید میری ہی کوشش بار ور ہو جائے۔ کچھ نہ کچھ تو آنا ہی ہو گا۔"

"دوسری جماعت تک تو پڑھا تھا۔" اماں بے حد شرمندہ نظر آ رہی تھیں۔ پھر بھی بولیں۔ "امیر کو کیا اعتراض ہو گا۔ اس بدنصیب کے دل میں بات بیٹھ جائے تو اچھا ہے۔ کتابیں منگوا دوں گی اللہ کرے کہ کچھ شد بد اردو ہی میں ہو جائے۔ آج کل بے پڑھی لکھی لڑکی کو کون پوچھتا ہے۔"

"اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔"

"تمھیں کچھ شکایت ہو تو میاں مجھ سے کہنا۔ اور اس کی ناسمجھی کا خیال نہ کرنا۔"

"یہ آپ کیا فرما رہی ہیں۔ میں برا تھوڑی مانتا ہوں۔"

افتخار کا اتیار برائے اتیار نہ تھا۔ زدبی پڑھتی کہ نہ پڑھتی لکدیر کڑھ لگاتی۔ انھیں کیا پروا تھی۔ مگر وہ تو ان کے دل میں آ بسی تھی۔ رگ رگ میں سما گئی تھی۔ اور ان سے خاموشی کی زبان میں چیخ چیخ کے کہہ رہی تھی۔

"مجھے اپنا بنا لو۔ اپنا لو مجھے۔"

اس آواز کا شور بڑھتے بڑھتے افتخار کی ہستی پر کہر کی طرح منڈھ گیا۔ اور وہ اسی شور میں اس طرح گم ہوئے کہ انھیں اپنی تعلیمی مصروفیت سے بھی اتنی دل چسپی نہ رہی جتنی انھیں ضرورت تھی۔ اب تو وہ یونیورسٹی سے جلد بھاگ آتے۔ سیکھتے سکھاتے بھی نہ تھے۔ گھر آتے اور اس دروازے کی دراز سے آنکھ چپکا دیتے جو اندرونی دالان میں کھلتا تھا۔ کتنا وقت زوبی کی دید میں گزر جاتا تھا۔ اس کا حساب تو کوئی ہوشمند ہی رکھ سکتا تھا۔ زوبی کو چلتے پھرتے ہنستے بولتے شہیر سے لڑتے جھگڑتے دیکھنا ہی وہ واحد مشغلہ تھا۔ جس میں افتخار کو بڑی دل چسپی تھی اگر کبھی زوبی دالان میں دکھائی نہ دیتی تو وہ روہانسے ہو جاتے۔ اس مرض کا علاج ان کے پاس نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو بس ایک کہ اسے اپنا لیں پھر ان کے خیالوں کے گلستان میں ان کی ماں اور خالہ کے ساتھ ساتھ ان کی منگیتر کے وجود ابھرتے۔ پھولوں کے ساتھ کانٹے! بس ان کے دلکش نازک اور حیات آفریں تصور لہو لہان ہو جاتے۔

ایک جاہل مطلق لڑکی کو شریک زندگی بنانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ وہ تو نرم مزاج سلیقہ مند، بے زبان بھی نہ تھی کہ عمر بھر کے لئے گوارا کر لی جاتی۔ صرف حسین شکل کو لے کر کیا کرنا تھا۔ جب کہ اسے اپنی خوبصورتی اپنے حسن کا بھی احساس نہ تھا۔ اپنی دلفریب۔۔۔ شخصیت کا ادراک نہ تھا۔ گھر بھر میں یہاں وہاں ننگے پاؤں دھب دھب کرتی پھرتی تھی۔ خوبصورت بالوں کو بکھرائے رکھتی

تھی۔ منہ بھی شاید دن بھر میں صرف ایک بار دھوتی ہو لباس پہننے کا سلیقہ تک نہ تھا۔ ہمیشہ ٹکنی کلر میں رہتی۔ اور اس لباس میں دو دو دن نکال دیتی۔

ایسی لڑکی کو کون خاندان قبول کر سکے گا۔

بس یہاں آ کے افتخار کے خیالوں کا رہوار اڑیل بن جاتا۔ وہ پیچھے ناکامی اور مایوسی کی تاریک راہوں پر واپس جا سکتا تھا۔ کامیابی اور امید کی روشن شاہ راہ پر ایک قدم بھی آگے نہ بڑھتا۔ اسی الجھن اور پریشانی میں ان کا دماغ گھومنے لگا۔

رہی سہی کسر والدہ محترمہ کے تنبیہی خط نے پوری کر دی۔ یہ بات تو وہ بارہا کہہ چکی تھیں۔ کہ انھیں گھر میں بہو لانے کی تمنّا تھی۔ حقیقی بہن کی لڑکی تھی اور صورت و سیرت میں مثالی تھی افتخار نے اپنے اور خالہ کے گھر میں اسے دیکھا تھا۔ پسند بھی کیا تھا پھر جب امّی نے پوچھا کہ وہ اسے پسند کرتے ہیں۔ امّی اسے بہو بنا کے لے آئیں۔ تب انھوں نے بڑی شد و مد سے سر ہلا کے اپنی مرضی واضح کر دی تھی۔ پھر دھوم دھام سے منگنی ہوئی تھی انتظار صرف افتخار کے والد کی زمین کی واگزاری کا تھا۔ جو کسی مقدمے میں الجھی ہوئی اور زیرِ سماعت تھی۔ پھر افتخار کی تعلیم ختم ہوتی انھیں ملازمت ملتی اور انھیں گھر بار سے لگا دیا جاتا یہ تو افتخار کی تقدیر تھی کہ زمین کا مقدمہ کچھ طویل ہو گیا۔ پھر چھوٹی بہن کی شادی کی گڑبڑ ہو گئی۔ اور معاملہ ٹلتا گیا۔ لیکن اب مقدمہ فیصل ہو چکا تھا بہن کے ہاں دو بچّے ہو چکے تھے۔ افتخار نے

ایم۔اے کر لیا تھا مگر ان کی شادی کا معاملہ ہنوز کھٹائی میں پڑا تھا۔ زینت کا بی اے کا آخری سال تھا۔ اور خالو محترم نے شرط لگا دی تھی کہ لڑکی تعلیم مکمل کر لے پھر شادی۔ آج کل پچھتر فیصد شادیاں ناکام ہو رہی تھیں۔ لہذا لڑکی کے پاس کسی ڈگری کا ہونا نہایت ضروری تھا۔ کہ کسی آڑے گاڑھے وقت وہ اپنا سہارا بن سکے۔ اس عرصے میں افتخار احمد نے سوچا کہ وہ بھی ڈاکٹریٹ کر لیں۔ ان سے یہ بعید تھا کہ وہ تہبند باندھ کر باپ کے ساتھ کھیتوں پر کسانوں کے ساتھ یا باغوں میں مالیوں کے ساتھ کام کرتے جبکہ والد صاحب کو کدال ہاتھ میں لے کر زمین گوڑنے سے بھی عار نہ تھا۔ افتخار کا ہاتھ جو صرف قلم پکڑنا جانتا تھا۔ پھاوڑا نہ چلا سکا۔ نتیجتہً وہ اپنا مقالہ یونیورسٹی میں داخل کرنے کے بہانے نظام آباد سے بھاگ کر حیدرآباد آگئے تھے۔ اور بیٹھے بٹھائے جی کو روگ لگا لیا تھا۔

اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انھیں کرنا کیا تھا۔ یا تو گھر بھر کی مخالفت یا پھر اپنی پہلی اور آخری محبت سے دستبرداری۔۔ والدین سے محرومی، خاندان بھر سے دشمنی بھائی بہنوں کا اختلاف انھیں سب کچھ گوارہ تھا۔ اگر گوارہ نہ تھا تو زوبی کا فراموش کرنا۔

وہ ایک روز سے انھوں نے محترمہ زبیدہ صاحبہ کو علم کے حصول کی طرف راغب کرنا شروع کر دیا تھا۔ محترمہ کی درسی کتب فراہم کی گئی تھیں۔ اور انھیں مطلع کیا گیا تھا کہ دماغ سے تھوڑا بہت جالے صاف کر کے اسے اس قابل کر لیں کہ اس میں کوئی اچھی بات

بخوبی سما سکے۔ اس اطلاع کے بعد زوبی صاحبہ کا یہ عالم دیکھنے میں آیا جو پھانسی پانے والے مجرم کا پھانسی کی اطلاع کے بعد ہوتا ہے بیزار تھیں زندگی سے۔ اماں کے پاس بیٹھ کر آنسو بہاتے تھے۔

"یہ کون سا منحوس مارا مردود الا کے بھیا نے سینے پر بٹھا دیا ہے جب کہا ناچائے لے کے جاؤ۔ بکے جاتا ہے کہ کچھ پڑھ لکھ لو۔ کچھ آدمی بنو اس کے علاوہ نامراد کے پاس کوئی بات ہی نہیں۔ ارے اسے کیا میں پڑھوں یا نہ پڑھوں۔ کل کہہ رہا تھا کہ تمہارے بھیجے میں بھس بھرا ہے۔ میں اسے صاف کر دوں گا۔ اماں۔ اس مردے نکلے سے کہہ دیں کہ جائے ہمارے گھر سے۔ میں نہیں پڑھوں گی۔ ہاں!"

"بیٹی! جو تم سے پڑھنے کو کہتا ہے وہ تمہارا بدخواہ نہیں۔" اماں نے سمجھایا۔ "ورنہ کسی کو کیا پڑی ہے بیٹی دیکھو آج کل زمانہ کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔ لڑکیاں کیا کچھ بن رہی ہیں۔ بادشاہ، وزیر، گورنر، بیرسٹر، انجینیئر، حساب داں کوئی شعبہ زندگی کا ایسا نہیں کہ جہاں عورتوں کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ وہ پڑھ لکھ کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیتی ہیں۔ ساری دنیا میں ان کی شہرت ہوتی ہے۔ نام ہوتا ہے لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ انھیں بڑے بڑے عہدے ملتے ہیں۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم بھی نامور بنو۔ لوگ تمھیں دیکھیں تم سے باتیں کریں تو مرعوب ہو جائیں۔ کیا تمھیں جاہل رہ کر صرف گرہستی سنبھالنا، مقدر میں گھر کیا کھانا اور بچے پالنا ہیں۔ یہی ہے تمہاری زندگی کا مقصد؟ بیٹی جتنی تم خوبصورت ہو کوشش کرو کہ اتنی ہی خوب سیرت بھی ہو جاؤ۔ بدزبانی۔ لڑاکا پن۔ جواب دینا، بھاگنا

پر آ بیٹھے تھے اور زدبی سے بولے "ہاں اچھی بات ہے بھئی۔ جو کچھ تم نے پڑھا تھا۔ وہ مجھے سناؤ۔ پھر میں دیکھوں کہ آگے کیا سبق دینا چاہیئے۔"

اماں چھوٹی چوکی پر بیٹھی ترکاری پلاؤ کے لئے سبزی بنا رہی تھیں۔ ان کے آگے ترکاری کا ڈھیر لگا تھا۔ سر جھکائے مٹر چھیل رہی تھیں۔۔ دھیان سارا صاحبزادی کی طرف لگا تھا۔

افتخار بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر رہے تھے۔ اس کی طرف دیکھنا دل گردے کا کام تھا۔ گلابی دوپٹہ سر پر لپیٹے اور مارے غصے کے گلابی ہی چہرہ لئے وہ شیرنی کی طرح افتخار کو گھور رہی تھی۔ ان کی بات کے جواب میں کاٹ کھانے والے لہجے میں بولی۔

"جو کچھ منحوس مارا پڑھا تھا وہ منہ کے آگے لا کے دھر تو دیا ہے اب بتاؤں کیا پڑھنا آتا ہو تو پڑھ لیجئے۔ اس میں کیا لکھا ہے؟"

"پڑھ کے سناؤ۔" افتخار جان بوجھ کر گرجے۔

"بھول گئے ہم۔ دس سال پہلے کی بات بھلا کوئی یاد رکھ سکتا ہے۔" وہاں معقول تاویل موجود تھی۔

"اچھا۔ آج سے پھر شروع کرو بسم اللہ سے۔"

"ایسی تیسی ہی۔ اس کے بعد الف بے سنائیے۔ ہاں۔ شاباش۔"

"بچوں کی طرح الف ب سناتے ہمیں اچھا نہیں لگتا۔" اس نے پتلے پتلے خوشنما لب سکوڑ لئے۔ "پڑھانا ہی ہے اگر تو بی۔ اے سے پڑھائیے۔ ہاں۔ نہیں تو۔"

"بی۔ اے۔" افتخار کی آنکھیں نکل پڑیں۔

"اور کیا۔" نذو بی نے کہا۔ "ابھی اس دن شبیر کہہ نہیں رہا تھا کہ اس نے پہلے میاں ٹرک کیا۔ پھر کچھ اور کیا۔ اور اب بی۔ اے۔ پڑھ رہا ہے۔ ہیں تو اس سے ایک سال چھ مہینے بڑی ہوں۔ میں نہیں پڑھتی اتنی نیچی نیچی پڑھائی۔ کچھ اور اعلیٰ کولاٹی کی کتابیں لے کے آیئے!"

"کولاٹی"؟

"وہ۔ کوالٹی ہے۔" افتخار نے سر کے درد پر قابو پاتے ہوئے کہا۔۔۔ کولاٹی نہیں۔ دیکھو تم پڑھ لکھ جاؤ گی تو صحیح لفظ بولا کرو گی۔"

"صحیح الفاظ بولنے سے کون مجھے اپنی جاگیر بخش دے گا!" اپنے ٹھب پر آکر نذو بی نے کہا۔ "مجھے جیسا آتا ہے میں ویسا ہی بولوں گی۔"

"پھر شروع کر دی بدزبانی۔" اماں گرجیں۔

"تو ان ماسٹر صاحب کے پاؤں کس نے پڑے ہیں۔ کہ ہمیں پڑھا ہیں۔" اماں سے بڑھ کر وہ گرجی تھی۔ "لاکے بیچ دیں صورت پر کتابیں۔ اماں سے باتیں الگ سنوا ہیں۔ نہیں پڑھنا ہے مجھے۔" اس نے ہاتھ مار کے کتابیں تخت سے نیچے گرا دیں۔ اور اٹھ کر تنتناتی چل دی۔

"میں تو ہار گیا اماں۔" افتخار نے کہا۔

"بس میاں سب اسی طرح ہار سے تھے۔" اماں تو جیسے کراہ اٹھی تھیں۔ مردہ ہاتھوں سے گاجریں چھیلنے لگیں۔

افتخار نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ وہ برآمدے کے کونے میں بیٹھی چکنی مٹی سان رہی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو۔" افتخار نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"گھر بنا رہی ہوں۔"

"کس کا گھر ہے۔"؟

"میری بلی کا اور کس کا!"

افتخار پاس آ کھڑے ہوئے۔ اس نے مڑ کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور دل کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں۔ کیسا پیارا سا رخ تھا کشش تھی ختم تھی اس پر۔ افتخار کی نظریں بالوں میں الجھ گئیں۔ جو ریشم کے انبار کی طرح فرش پر ڈھیر تھے۔

"کیا ہے"؟ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"گھر بنانا تو مجھے بھی بہت اچھا آتا ہے۔ میں چاہتا ہوں خوبصورت سا تمہارا گھر بنا دوں"۔

"سچ!" خوشی سے چمکتی آنکھیں لئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دلربا قامت، من موہ لینے والی اٹھان، بے قابو کر دینے والا انداز۔ افتخار نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سر کو جنبش دی۔

"اچھا تو پھر بنائیے"۔ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا "یہ مٹی کے گوندے بنا بنا کے دیتی جاؤں گی۔ چھت اونچی رکھئے گا کمرے، مطلب یہ کہ بیڈ روم تین عدد ۔۔۔ اب بچے دینے والی ہے نا۔ کیا معلوم کہ دو دے یا تین دے دے۔ ایک کمرہ دیوان خانہ کیا۔" اور بات ختم کر کے وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

افتخار پاس بیٹھ گئے اور مٹی کا بڑا سا گوندا اٹھا لیا۔ پھر وہ مستقبل کے بڑے سے محل میں پہنچ گئے جہاں بڑے بڑے آہنی شہتیر پڑے تھے۔ کنکریٹ، سیمنٹ اور پتھروں کے انبار لگے تھے۔ مشینیں گھڑ گھڑا رہی تھیں سیکڑوں راج معمار ایک عالیشان

کوٹھی کی تعمیر میں مصروف تھے۔ خواب ان کی آنکھوں میں مسکرانے لگے۔ ان گھر نیچی نیچی دیواروں کو وہ پرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"زوبی!" ایک خواب ان کے لبوں پر بھی سرسرایا۔

"ہوں"۔ اس نے ایک تونداہوں اچھالا کر وہ ان کے بازو پر جھپک کر دھپّہ ڈال گیا۔ اور پھر پاؤں پر گرا۔ زوبی کی ہنسی تیز ہو گئی۔

"تم نے کبھی آئینہ دیکھا ہے؟" افتخار نے پوچھا۔

"اتنے سارے آئینے گھر میں ہیں کیوں نہیں دیکھا۔ واہ۔ پوچھی بھی تو گدھے پن کی بات۔"

افتخار نے کھنکھار کر گدھے پن کی بات شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اتار لی۔

"تم نے اپنی شکل دیکھی تو کیا سوچا تھا؟"

ایک بے تُکا سا قہقہہ لگا کر اس نے جواب دیا۔ "یہی کہ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل۔"

"لیکن ایسا نہیں ہے زوبی!" کاش وہ کھوپڑی پر زور دیتی۔۔ ایک گہری آہ بھر کر افتخار نے سوچا۔ اگر اس کی جگہ کوئی تعلیم یافتہ سمجھدار لڑکی ہوتی تو حسن و عشق کا یہ ڈرامہ اور استاد و شاگرد کا یہ رشتہ شیریں فرہاد کی روایت پر پہونچ جاتا۔ مگر یہ کودن۔ افتخار نے اس پتھر کو سنگھار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم چاند سے زیادہ خوبصورت، تاروں سے زیادہ خوشنما کلیوں کی سی نازک اور پھولوں سے زیادہ حسین ہو۔ ابکی آئینہ دیکھنا تو میری نظروں سے دیکھنا تم سے تو بڑے سے بڑا حسن کا منکر

بے اختیار محبت کر سکتا ہے۔ تم تو چاہے جانے کے قابل ہو زدبی
بہت اچھی ہو تم تو"

"مگر اماں تو کہتی ہیں کہ ـــــ!"

"ہماری تمہاری باتوں کے درمیان اماں کو مت لاؤ"! افتخار نے اس
کی بات کاٹ دی۔ "اماں کی اپنی نظریں ہیں اور میری اپنی۔"

"تو کیا ــــ!"

"ہاں زدبی بہت پیاری ہو تم"! افتخار کی آواز جذبات سے
بوجھل تھی۔ "مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

"سچ!"

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"اچھا۔ میں اماں سے کہوں گی کہ آپ تو مجھے مٹی کا ڈھیر، گوشت
کی چربی اور جنے کیا کیا بنایا کرتی ہیں مگر یہاں صاحب۔ نہ تو یہ افتخار
صاحب تو کہتے ہیں کہ میں چاند سے زیادہ چمک۔ اور اور تاروں سے
زیادہ ـــــ تاروں سے زیادہ۔ کیا کہا تھا آپ نے۔ دیکھا بھول
گئی۔ ایسا موت کھایا دماغ ہے میرا۔ اوپر سے آپ سب پیچھے
پڑے رہتے ہیں کہ کچھ پڑھ لکھ لو۔ اس بھیجے پر بھلا کیا پڑھوں
لکھوں گی!"

افتخار کا جی چاہا کہ یا تو اپنا سر پیٹ لیں یا اسے پیٹ کے دھر
دیں۔ ایسی بھنبس صفت لڑکی کہیں دیکھی نہ سنی تھی۔ انھوں نے
اس کا بازو سختی سے پکڑ کر کہا۔ "نہیں۔ خبردار، اماں سے کچھ نہ کہنا
ورنہ میں زبردستی کسی اسکول میں تمہیں شریک کرا دوں گا۔ اور وہاں

کی ٹیچر سے کہوں گا کہ ــــــــ"

اسکول میں شریک کرانا اس کے لئے بڑی ہولناک سزا تھی۔ لہٰذا تیزی سے سرہلاتی ہوئی بولی۔ "اے مہمان صاحب، آپ تو بگوڑا سے مذاق کو لے دوڑتے ہو۔ اماں سے کچھ نہ کہوں گی۔ اب اس گھر میں کھمبے گاڑ کے چھت تو ڈالنے۔ میں کھمبوں کے لئے پیار کی چھڑی لے کر ابھی آئی۔ آبا کی چھڑی ہے۔ مگر اب کون کام کی۔ وہ اٹھ کر بھاگ گئی اور منتی ٔبرا ہاتھ پیشانی پر رکھ کر انتخار سوچنے لگے۔ کہ اس پتھر میں جونک کیسے لگے گی۔ محبت کا بخار تو انھیں بڑی زور کا چڑھا تھا۔

ان دنوں گھر میں اماں اور زوبی کے سوا کوئی نہ تھا۔ امیر احمد کا خط آیا تھا کہ وہ ہفتہ بھر کے بعد گھر آسکیں گے۔ ان کی بیوی عازرا اپنے میکے میں تھیں جب امیر احمد نہ ہوتے تو وہ اپنی پاگل بہن کی خبر گیری کے لئے میکے آجاتی تھیں۔ رہیں شائستہ تو ان کا گھر بار تھا شہیر کا کچا امتحان تھا۔ اسے بھی پڑھائی کے چکر میں گھر سے دور رہنا پڑتا تنہائی اور یکجائی نے بالآخر زوبی کو متاثر کرنا شروع کیا تھا۔ اور پھر یہ ہوا کہ بھولی بھالی جاہل مطلق زوبی کے دل نے بھی خلش آمیز دھڑکنا سیکھ لیا۔ اپنی کیفیت کا اسے کوئی ادراک نہ تھا۔ محبت کیا چیز ہے یہ کتنی جان لیوا ہوتی ہے۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ بس اس نے اپنے جذبوں کا خراج اس طرح ادا کیا تھا کہ انتخار کا خیال رکھنے لگی تھی۔ کہے بغیر ان کے ملبوسات پریس کر دیتی۔ کمرہ صاف کرتی حتیٰ کہ انتخار کے جوتوں پر پالش کرنے سے بھی اسے کوئی عار نہ تھا۔

اماں جو زبیدہ کی بے حسی اور پھوہڑپن سے مایوس و عاجز ہو گئی

تھیں۔ وہ خوش رہنے لگیں تھیں۔ بالآخر افتخار اسے آہستہ آہستہ آدمی بنا رہے تھے۔ افتخار نے خوش آئند مستقبل کے بھروسے اپنی والدہ کو خط لکھ دیا تھا کہ انھیں پرانی منگنی پسند نہیں۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ ان کی دلیری اور ناعاقبت اندیشی ان کے اور زبیدہ کے حق میں کتنی خطرناک اور سنگین ثابت ہو گی۔ اپنی ماں کے بلاوے پر وہ گھر نہیں گئے۔

زوبی کی پرورش ایک ایسے گھر میں ہوئی تھی جو حد درجہ قدامت پسند تھا۔ ترقی اور زمانے کی نئی روشنی کا جس پر سایہ تک نہ پڑا تھا۔ شبیر صاحب کا خاندان بڑا مذہبی تھا۔ ظاہر تھا کہ انھیں بیوی بھی ایسی ملی جو دیندار اور مذہب پرست تھی۔ ان کے بچے اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ پھر شبیر صاحب گزرے ان کا خاندان نہاں کہاں کا ہو رہا۔ ان کا اپنا گھر سب سے الگ تھلگ ہو گیا۔ لیکن مذہب کا پختہ رنگ ان پر سے نہ چھوٹا۔ ان کی تاکید تھی کہ دنیا میں بے شک دنیا والوں کی طرح رہو مگر دین کو نہ بھولو یہاں کا قیام مختصر اور وہاں کا طویل ہے۔ لہذا انھوں نے اپنے بچوں کو بھی دینداری سکھائی تھی۔ نماز، روزہ، تلاوت، ایمانداری شرافت تمام اصول ایک اچھے انسان کے ہو سکتے ہیں۔ وہ شبیر صاحب کے گھر میں رائج تھے۔ اماں پر جوانی ہی میں جو افتاد پڑی تھی۔ اس

سنے انھیں قدرت سے منحرف تقدیر سے برگشتہ اور حالات سے خفا ہوکر دنیاداری کی طرف راغب کرنے کے بجائے قدرت الٰہی کی طرف پھیر دیا تھا۔ ان کا اثر ان کے بچوں پر بھی پڑا۔ ان کے گھر میں صبح چار بجے ہی دن نکل آتا۔ چہل پہل سی شروع ہو جاتی۔ ایسے گھر میں زبیدہ نے جنم لیا تھا۔ شروع ہی سے سبکو مذہب کے ارکان کا پابند دیکھا۔ وہ بھی مذہبی بن گئی۔ ماں نے اسے پردے میں رکھا تھا۔ اس کی کوئی سہیلی نہ تھی جو اسے نئے زمانے کی آنکھیں خیرہ کرنے والی باتیں بتاتی۔ فلم بینی سے وہ دور تھی سیر سپاٹے اسے آتے نہ تھے۔ اسے پتہ ہی نہ تھا کہ اس گھر کے باہر بھی کوئی دنیا ہے جو بڑی عجیب ہے حد خوبصورت اتنی ہی بدصورت جتنی برگشتہ اور وفادار ہے۔ اسی قدر ڈراؤنی اور بے وفا بھی ہے۔ وہ اپنے گھر کے حصار میں بند بڑے مزے سے جئے جا رہی تھی۔ ماں کی معصومانہ نافرمانی، بہن بھائیوں سے جھگڑنا، روٹھ کے بیٹھ جانا بچوں کی طرح ضد کر کے من مانی کرنا اور زبان درازی ہی اس کے مشاغل تھے۔ عمر کے سترہ سال گزر چکے تھے مگر وہ سات سال کے بچے سے بھی معصوم اور بے خبر تھی۔ ابھی تک ـــــ لیکن اب اسکی عمر نے اس کے دماغ میں کلبلانا، پلکیں جھپکانا اور اس خطرناک عمر کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے اصرار کرنا شروع کر دیا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکی۔ اب اس کے خیالات اس سے منحرف کیوں ہو گئے تھے۔ اسے سوچنے کی عادت ہی نہ تھی۔ اور اب ہر دم وہ سوچتی رہتی۔ ایسی باتیں اس کے ذہن پر یلغار کرتیں کہ وہ گھبرا اٹھتی پریشانی اور بے چینی

نے اس کی نیندیں اس کا سکون آہستہ آہستہ چھین لیا۔ وہ
کسی سے کچھ نہ کہتی اسے کیا ہوا تھا۔ اماں کی خدمت زیادہ بے حد
گستاخ اور بے ادب تھی مگر ان سے ڈرتی بھی تھی۔ ان سے محبت بھی
کرتی تھی۔ اپنی کسی فکر میں انھیں شریک کر کے انھیں بھی مضطرب کرنا
اسے پسند نہ تھا۔ اماں تو یونہی بیمار رہتی تھیں۔ زیادہ بیمار ہو جاتیں
کیا وہ کسی سے یا اماں سے کہہ سکتی ہے کہ اب اسے ہر دم کوئی آدمی
یاد آتا رہتا ہے۔ جس سے اس نے اجنبی باتیں کی تھیں۔ اسے اپنے
حسن کا احساس نہ تھا جس نے اسے احساس دلایا تھا اور اب
اسے بننا سنورنا آگیا تھا۔ جب اس نے اجلے کپڑے پہنے تھے بال
سنوارے تھے۔ کاجل لگایا تھا تو اماں نے اس کی تبدیلی بڑی
حیرت و مسرت سے دیکھی تھی۔ اور شکر گزار تھیں۔ افتخار میاں ... نے
جنھوں نے ان کی گنوار سی لڑکی کو کچھ تہذیب سکھادی تھی۔ اس حد
سے اماں آگے نہ جا سکیں۔ وہ محبت لفظ کے معنوں سے آشنا نہ تھیں
افتخار میاں بے حد شریف اور کم سخن تھے۔ ان پر کسی ایسی ویسی بات
کا بدگمانی گناہ کے مترادف تھی۔ اور دولی ان پڑھ بے حس تھی۔ اماں کو
پتہ نہ تھا کہ جوانی دل اور دماغ میں بھی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ ان پر بھی [illegible]
پھول کلیاں کھلتے ہیں۔ اماں جیسا خود کوشش بیٹا ہی ہی سمجھتی تھیں یا
تو شاید انھوں نے ان پر کونپلیں کھلتے دیکھے ہی نہ تھے۔

زندگی اپنی ڈگر پر اپنے خفیہ تقاضوں کو نادانستہ پورے کرنے لگی۔۔۔!
اب بھی وہ اتنی ہی گستاخ، منہ پھٹ، بے ادب اور لڑاکا تھی۔ لیکن
اس کے ساتھ ہی اسے اپنے آپ مسکرانا آگیا تھا۔ خود کو نکھارنے کا

جی چلنے لگا تھا۔ یہ بھی چاہتی تھی کہ اس کے حسن کی کوئی تعریف کرے اور تعریف افتخار کے سوا کون کر سکتا۔ اس مقصد کے لئے ان کے سامنے رہنا بار بار خود کو اجاگر کرنا بھی ضروری تھا۔ اس کا خاموش سلوک رفتہ رفتہ شور مچانے لگا۔ اور تب افتخار بھی بہت کچھ سمجھ گئے۔ اگر جاہل تھی تو زدبی تھی جسے نہ تو آنکھوں سے باتیں کرنے کا گر معلوم تھا۔ نہ وہ زبان سے کچھ کہنے کی جرأت کر سکتی تھی۔ لیکن افتخار تو بڑی دور تک تعلیم یافتہ تھے۔ اور انھیں کئی ایک زبانیں بھی آتی تھیں۔ گونگی زبان بھی۔ نظروں کی زبان بھی چھوٹی چھوٹی باتوں میں معنی و مفہوم کے قلزم موجزن ہو جائیں تو آدمی بے چارہ ڈوب ہی جاتا ہے۔"

انھیں باور کرنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہیں لگی کہ زبیدہ پر ان کی محبت کا سحر اثر کرنے لگا تھا پہلی بار جب اس نے کسی بات پر بد زبانی کے بجائے چپکے سے پلکیں جھپکا بس تب ہی افتخار کے دل میں ان گنت جذبوں کے رنگ برنگے الے کھل اٹھے۔

انھیں زدبی اپنی دسترس سے بہت قریب نظر آئی۔ ہاتھ بڑھائیے چھو لیجئے۔ لیکن کچھ انسانیت ان میں تھی یا امیر اور رضا کی دوستی کا پاس تھا۔ یا نمک خواری کا احساس تھا۔ کہ انھوں نے زدبی کو ہاتھ بڑھا کر چھوا نہیں۔ بلکہ بڑی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی والدہ کو اپنی خواہش سے آگاہ کرتے ہوئے پرانی منگنی کے توڑ دینے کا الٹی میٹم دے دیا۔ اس کے بعد انتظار کی جانگسل گھڑیاں آئیں۔ ایک جواب ملتا اور پھر وہ

امیر احمد سے زوبی کا ہاتھ طلب کرتے۔

ان کے شریفانہ اور عمدہ صاف ستھرے رشاغل جاری تھے۔ لکھنا پڑھنا۔ یونیورسٹی کی آمدورفت اور باقی وقت اماں کی ہم نشینی اور ان کی خدمت۔ اماں کے دل پر ان کی شرافت خوش طبعی، حسن سلوک کا گہرا اثر ہو گیا تھا۔ فرشتہ سمجھتی تھیں انھیں۔ نجانے کدھر سے ان کے گھر میں اتر آیا تھا۔ دس بارہ دن ہی میں افتخار احمد اماں کے مختصر سے کنبہ کے ایک اہم فرد بن چکے تھے۔ اب اماں یہ چاہتی تھیں کہ اس گھر سے وہ کبھی نہ جائیں۔ اور وہ گئے بھی نہیں ان دنوں گھر میں خیر چہل پہل تھی۔ امیر احمد دو تین دن کے لئے آئے ہوئے تھے۔ عذرا اور شائستہ بھی تھیں۔ رضا بھی آفس سے شام کو یہیں آجاتے۔ اماں ایسے ماحول میں بے حد خوش و مطمئن رہتیں۔ ایسے دل خوش کن لمحے ان کی زندگی میں بہت کم اور گنے گنائے آتے تھے۔ کھانے کے بعد دالان میں سب اکٹھا ہو جاتے رضا کا بچہ اور امیر احمد کے بچے اماں کے آ لپٹتے۔ عذرا شائستہ بحث میں مصروف ہو جاتیں۔ زوبی اور شبیر کے جھگڑے منھ کا مزہ بدلنے کو بہت تھے۔ اماں ممنون و شکر گذار نظروں سے آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر دعا مانگا کرتیں۔ اس بھرے پرے قہقہے بکنار گھر کو کسی حاسد کی نظر نہ لگے۔

سب کے ساتھ افتخار احمد کا شامل ہونا بہت ضروری تھا۔ وہ تو اپنے تھے۔ ان سے کوئی بات چھپی ہوئی نہ تھی۔ کوئی راز راز نہ رہا تھا۔

وہ دن بہت چمکیلے ہونے لگے تھے۔ بڑے سے بارش کا سلسلہ بند تھا۔ مگر شجر حجر در و دیوار پر دھلا دھلایا سا ایک نکھار حسن و دلکشی بن کر چھایا ہوا تھا۔ راتیں ستاروں سے جگ مگ کرتیں۔ کبھی حباب سی بدلیوں سے چاند آنکھ مچولی کھیلتا۔ اور وہ لوگ ہارسنگھار کے مہکتے ہوئے پیڑ کے پاس کرسیاں بچھا کے بیٹھتے۔ پھر ماحول سحور سن ہو جاتا۔

امیر احمد افتخار کے ممنون تھے۔ ابھی ان کی مفارقت افتخار کی رفاقت میں بدل چکی تھی۔ اماں کی صحت میں نمایاں فرق نظر آرہا تھا۔ اماں نے ان سے افتخار کی بے انتہا تعریفیں کی تھیں۔ چنانچہ امیر احمد نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد افتخار سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے جادو کی چھڑی پھیر دی ہے۔ مجھے تو وہ بیمار سا ماحول ہی نظر نہیں آتا۔ خدا کمال ہے بھائی، در و دیوار تک مسرور دکھائی دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ خوشی اماں کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ مجھے تو اماں کی صحت کے بارے میں سخت تشویش تھی۔ مگر اب میں تمہارا شکر گذار ہوں۔ میری عدم موجودگی میں تم نے اماں کا اتنا خیال رکھا ہے۔ کہ ——— !"

بس۔ اس قسم کی مغائرانہ گفتگو مجھے احساس دلاتی ہے کہ۔ میں اور تم ایک دوسرے سے الگ ہیں "۔ افتخار احمد نے احتجاج کیا۔ "بھائی یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اماں جیسی تمہاری ہیں ویسی ہی میری بھی ہیں۔ بلکہ میری کچھ زیادہ ہی ہیں۔ کیوں کہ میں اپنی امی سے بہت دور ہوں۔ سچ پوچھو تو اماں کی موجودگی میں مجھے اپنی امی کی تو یاد بھی

نہیں آئی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ تم میرے شکر گذار خوامخواہ ہو رہے ہو۔ الٹا مجھے تم سب کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ کہ اس گھر میں رہتا ہوں جہاں مجھے ماں کی مامتا، بہنوں کی محبت اور بھائیوں کا خلوص ملا ہے۔" عجیب عجیب سے دن گزر رہے ہیں۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے کہ تم چلے جاؤ گے۔" امیر احمد نے کہا۔

"نہ جائیں۔" عذرا نے کہا۔ ان کی شادی کر دی جائے یہیں بند ہو کر رہ جائیں گے۔"

"بیٹے رہ جائیں گے بیوی کو لے کر یہیں چلے جائیں گے۔" شائستہ نے کہا۔ "میں تو یہی سوچتا ہوں کہ اماں کی تنہائی اور گھر کا ماحول بدلنے کے لئے کسی ایسے آدمی کی موجودگی بہت ضروری ہے جو دن رات یہیں رہے۔" رعنا نے کہا۔ "یہ اداسی اور ڈپریشن جو اماں کو تکلیف دیتا ہے۔ سب تنہائی کی وجہ سے ہے۔ اب دیکھو ان کی موجودگی میں ایک دفعہ بھی ڈپریشن نہیں ہوا۔"

"بھائی۔ اب زیادہ شرمندہ نہ کرو۔ ایسا میں کون سا آدمی ہوں۔" افتخار نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "بہت تعریف ہو چکی۔ مگر میں پوچھتا ہوں آخر بھابھی یہاں کیوں نہیں رہتیں۔ امیر یہاں رہیں چاہے سسرال۔ مگر بھابی کا یہاں رہنا تو ضروری ہے۔ اس عرصے میں پہلی بار آپ کو گھر پر دیکھ رہا ہوں۔ یہ آخر کیا ہے۔؟"

"بیٹے۔ وہ بھی مجبور ہے کیا کرے۔؟" اماں نے کہا۔ "اس کی ماں نہیں ہیں باپ ملازمت سے بندھے ہیں۔ ان کی بڑی بہن ایک ہاتھ سے معذور اور بے چاری کچھ پاگل ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے

عذرا کا گھر پر رہنا بہت ضروری ہے۔ اب جبکہ امیر احمد یہاں
رہتے نہیں ہیں۔ تو ہم ہی نے ان سے کہا ہے کہ گھر چلی جایا کریں!
یہاں کیا کام ہے۔ دو جانوں کے لئے تھوڑا بہت کھانا تو عبدل ہی
پکا لیتا ہے۔"

"خیر" رضا نے کہا۔ پھر ان کی نظریں زوبی پر پڑیں۔ آج وہ ٹیکنی کلر
ہی نہیں تھی۔ سلیقے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کاسنی رنگ کا
چھپا سا پاکیزہ سی قمیص پر سفید چوڑی دار پاجامہ۔ کاسنی رنگ کا
دوپٹہ جس کے کناروں پر سفید گوٹا لگی تھی۔ ان کپڑوں میں وہ بہت
پرکشش ہو رہی تھی۔ رضا کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ انھوں نے
کھانس کر گلا صاف کیا۔ اور بولے۔ "میں تو دیکھ رہا ہوں کہ انتخاب
میاں نے ایک اور حضرت پر بھی جادو کی چھڑی گھمائی ہے۔ ایک
صاحب جو کڑک مرغی کی طرح پھولے سوتے اور شتر بے مہار رہتے
تھے۔ اب تو بھائی کچھ آدمیت کے جامے میں نظر آ رہے ہیں۔ اور
وہ تیز بلو اور جو منھ کے باہر رہتی تھی آج منھ کے اندر ہے۔ بھائی میرا
تو جی نہیں لگ رہا۔ ہمیشہ ہی کڑوی اور کھٹی چیزیں کھاتا رہا ہوں۔ اس
لئے یہ پھیکی سیٹھی مونگ کی دال حلق سے نہیں اتر رہی۔"

"ہا! ہے دال۔" زوبی حسب عادت چیخ گئی۔ "دوپہر کو کوفتے
پلاؤ بھرا تھا آپ نے۔ اب اماں قورمہ اور بگھارے چاول پکوا رہی
ہیں۔ ناشتے میں پوری تلی کھائی تھی۔ خواہ مخواہ بدنام کرنے کی
ٹھیتی ہیں کہ نہیں کہ لو صاحب سسرال میں داماد کو مونگ کی دال ٹھنسائی
جاتی ہے۔"

"بس اسی کو ترس رہا تھا میں!" رضا ہنسنے لگے۔

"اب ذرا منھ کا مزہ بدلا ہے۔ تو آپ مجھے حضرت اور صاحب کہہ رہے تھے کیا؟" وہ ان پر امنڈ پڑی۔

کیوں نہ کہوں،" رضا نے دونوں ہاتھ آگے کرکے اسے روکا۔ "آج تو تم اس قدر اچھی لگ رہی ہو کہ جی چاہتا ہے تمھیں پڑیا میں باندھ کر گھر لے جاؤں۔ سنو بی بی، ہمیشہ ایسے ہی اچھے اچھے کپڑے پہننے رہا کرو کنگھی چوٹی کیا کرو تاکہ دوسروں کو بھی اچھی لگو۔"

"دولہا بھائی۔" خلاف معمول اس نے محجوب ہو کر سر جھکا لیا اور بے حد سادگی سے بولی۔ "مجھے تو کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ یہ تو ہمان صاحب نے ایک دفعہ کہا تھا کہ کیا تم آئینہ نہیں دیکھتیں۔ تم اتنی خوبصورت ہو۔ پھر۔ میں نے جب آئینہ دیکھا تو دولہا بھائی سچی میں اتنی اچھی لگی۔ اس لئے۔ میں نے یہ کپڑے ________!"

موسم سرد تھا مگر افتخار کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ ایکدم سے وہ سکتے میں رہ گئے۔ انھیں پتہ نہ تھا کہ یہ لڑکی اتنی شدید گردن ہو گی۔ بے چارے کا عجیب حال ہو گیا۔ ادھر رضا اور امیہ انھیں دیکھنے لگے تھے۔ ان کی نظروں میں کسی خفگی یا ملامت کا شائبہ نہ تھا۔ لیکن ان کی نظریں افتخار کو چنگاریاں برساتی لگیں۔ ستم یہ بھی تھا کہ اماں نے اس احمق کی باتیں اور ہنسی کی آواز سنی تھی۔ کیا سوچتی ہوں گی۔ ان کا خیال تھا اماں پر سے اٹھ گیا ہو گا۔ وہ بھی روایتی بد معاش ثابت ہوئے۔ فرق ان میں اور سر ۔۔۔ چھاپے فرہاد میں صرف یہ تھا کہ ان کے چہرے پر شرافت

اور تعلیم کا نقاب پڑا تھا۔

ایک سکنڈ میں دس ہزار خیالات افتخار کے ذہن میں اچھل پھاند مچا کے ختم ہو گئے تو انھوں نے سنبھالا لیا۔ اور جی کڑا کر کے اور لہجہ سنبھال کر بولے۔ "میرے کہنے ہی کا تو یہ اثر ہوا ہے کہ اب کچھ آدمی معلوم ہونے لگی ہو۔ یقین نہ ہو تو ابھی جا کے ایک بار پھر آئینہ دیکھ لو۔ پہلے گوریلا اسبندر یا دکھائی دیتی تھیں۔ اب انسان دکھائی دیتی ہو کہ نہیں اور ابھی بھی یقیناً لگتی ہو۔"

"مگر بھائی بقول ان محترمہ کے کچھ ادب، بے بھی سکھائی کہ نہیں۔" رضا کے دل سے شک کا سایہ مٹ گیا تو انھوں نے پوچھا۔ "اتنا تو کم سے کم کردو کہ اگر ان کے دولہا میاں پردیس میں ہوں تو جیسے کہ یہ فرماتی ہیں کہ چار الفاظ اپنی خیریت کے لکھ سکیں۔"

"دنیا کا کوئی آدمی وہ بھیجا نہیں لایا کہ انھیں پڑھا سکے!" شائستہ نے کہا۔

"ناکام کوشش میں نے ضرور کی تھی!" افتخار سر سر کرتے بہتے پسینے پر ابھی قابو نہ پا سکے تھے۔

"میں تو کہتی ہوں کہ کسی بھلے بھائی کو دیکھ کر اماں اب ان کے ہاتھوں میں مہندی رچا دیں۔" شذرا نے کہا۔

"کوئی مٹی کا بھلا بھائی کاہے کے لئے میرے ہاتھوں میں مہندی لگانے لگا۔" زوبی نے بھاوج کو کڑی نظروں سے گھورا۔ "میں خود نہیں لگا سکتی کیا۔ ارے عمو میر کی سالگرہ میں لگائی ہی تھی۔ ابھی اس کی سرخی باقی ہے۔ کوئی اور موقع آئے گا تب پھر لگاؤں گی۔ اور کیا۔"

"ہم کہاں کسی کو ڈھونڈنے جاؤں بیٹی!" اماں نے ہلکی سی سانس لے کر کہا۔ "یہ کام بھی اللہ نہ کھلے اب تم ہی لوگوں کو کرنا ہے۔ سچ مانو کہ اتنی فکر ہے مجھے اس کی کہ دن تو جیسے تیسے دیوانوں کی طرح ایسے ویسے کاموں میں کٹ جاتا ہے مگر رات عذاب بن جاتی ہے۔ سوچتی رہتی ہوں کہاں بے چاری کا قفل پڑا رہے گا۔ نہ تعلیم نہ سلیقہ صورت کو کوئی لے کر کیا کرے گا۔"

"اماں اسے صرف بیس برس کی ہو جانے دیجئے!" امیر احمد بولے۔ "پھر انشاء اللہ اس کے لئے جی جان سے سوچیں گے۔"

"اماں تو فکریں بڑھا لیتی ہیں۔" عذرا نے کہا۔ "آپ کی طرف سے سوچنے والے ہم لوگ نہیں ہیں کیا۔"

"ایک صاحبزادے میری نظروں میں ہیں۔" رضا بولے۔ "ابھی تک چونکہ یہ مسئلہ اٹھا نہیں تھا۔ میں نے ادھر دھیان نہیں دیا تھا۔ اب گھر جاؤں گا تو ان کا شجرہ نسب معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"ہاں بیٹا بس خیال رکھنا۔ ویسے دو سال انتظار بھی برا نہیں۔" اماں نے کہا۔ "مگر دو سال بڑی مدت ہے۔ آدمی دو لمحوں بعد کا حال بھی نہیں جانتا۔ اس لئے میں کہہ رہی تھی کہ ایک فرض جس قدر جلد اچھی طرح ادا ہو جائے۔ اور میں اپنی آنکھوں کے سامنے اسے رہتے بستے دیکھ لوں۔ بس۔"

"انشاء اللہ دیکھ لیں گی اماں۔ گھبرائیے نہیں۔" امیر نے کہا۔

دفعتہً وہاں عبدل آیا۔ اور انتشار سے بولا۔ "صاحب۔ ادھر آپ کے لئے ایک آدمی آیا ہے۔ اپنا نام شیخ میراں بتاتا ہے۔ کہہ رہا

ہے کہ صاحب گھر پر ہوں تو جلدی بھیج دو!"
اف! یہ کمبخت یہاں کہاں۔ اگرچہ سی سر کا کر افتخار کھڑے ہو گئے
"کون ہے یہ شیخ مراں ؟" امیر نے پوچھا۔
"ابا کا بڑا معتمد گماشتہ ہے" بوکھلاتے ہوئے افتخار نے کہا۔
معلوم ہوتا ہے کہ ـــــ اچھا میں ابھی آتا ہوں" یہ کہہ کر وہ تقریباً بھاگتے ہوئے باہر گئے۔ یہ لوگ بھی دیر سے ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اکتا گئے تھے۔ اٹھنے لگے۔ اماں نے عذرا سے کہا "لے بیٹی بچہ سو گیا ہے۔ اسے اندر لٹا دے اور کچھ گرم اڑھا دینا۔ سردی بڑھنے لگی ہے" پھر امیر اور رضا سے پوچھا۔ "رات کیا کھاؤ گے کہتے جاؤ۔ تو میں لڑکیوں سے پکوا دوں۔" "میں تو قورمہ اور بگھارے چاول ـــــ"
"میرے لئے تو آپ اپنے ہاتھ سے پسندے پکا دیجئے" رضا نے کہا۔ "الگ کمرے میں جا کے کھاؤں گا۔ ورنہ امیر صاحب بھی بیچ بیچ میں ہاتھ مارتے ہیں۔ یہ مجھے گوارا نہیں"
"آج میں خود بھی مصالحہ دار چلغوزے لے جا کر الگ کھاؤں گا۔"
امیر احمد بگڑ گئے۔ "دروازہ بند کر کے۔ خوشبو تک سونگھنے کو ترس جائیں گے آپ!"
"ان لوگوں کی چالاکی دیکھی اماں آپ نے" شائستہ بولیں۔ "جھگڑا آپس میں کیا مگر ہمیں بتا دیا ایک کو پسندے چاہئیں ایک کو مرغی۔ لیکن یہ کچھ نہیں پک رہا۔ آج رات صرف پالک کا ساگ اور پھلکے ہیں۔ نہ قورمہ نہ بگھارے ـــــ!"

آپ سے کچھ نہیں کہہ رہے ہے۔" رضا نے دیدے مٹکائے۔ " اماں نے ہم سے پوچھا تھا۔ ہم نے اماں سے کہا ہے۔ آپ ساگ، بھاجی، گھاس پھوس ہم لڑکوں کے ساتھ کھائیے گا۔ ہم سے کیا مطلب۔"

"ارے چلو بھی یار۔" امیر رضا کو کھینچ لے گئے۔ چائے کی پیالیاں جب زرینہ اٹھا لے گئی تو ادھر ادھر دیکھ کر شائستہ نے کہا۔ "اماں۔ ایک بات آپ سے کہنا چاہتی تھی۔ آپ نے اتنے دن سے افتخار بھائی کو اپنے ہاں رکھ کر دیکھا ہے۔ صورت سیرت سب سامنے۔ آپ نے انھیں کیسا پایا ہے؟"

"فرشتہ صفت لڑکا ہے بیٹی!" کچھ مشکوک ہو کر اماں نے کہا۔ "مگر تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟"

"میں سمجھ گئی ہوں بھابی کا مطلب۔ مگر شائستہ۔" عذرا نے کہا۔ کہاں وہ ایک بڑے زمیندار کے بیٹے، بڑھے لکھے۔ کہاں ہماری بے پڑھی متوسط خاندان کی لڑکی جوڑ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"بیٹے ہیں! اگر ایسا ہو جائے تو راج کرے گی میری زبیدہ۔" اماں سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ مگر عذرا بھی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ ان میں اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کے علاوہ میں نے تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔ کہ ان کی شادی ہو چکی ہے یا کہیں رسم و رسم ہوئی ہے اپنے منھ سے کچھ کہنا مناسب بھی تو نہیں ہے۔"

"افتخار بھائی ان کے بہت زمانے کے دوست ہیں۔" شائستہ نے کہا۔ "یہ بھی اکثر ان کی زمینوں پر جا کے مہینوں رہ کے آئے ہیں انھیں سب پتہ ہے کہ ان کا خاندان بہت اعلیٰ ہے۔ لوگ شریف ہیں افتخار

بھائی کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ شادی ہو چکی ہوتی تو وہ بھلا یہاں کیوں رہتے۔ میں ان سے ذکر کروں گی کہ باتوں باتوں میں یہ مسئلہ چھیڑیں۔ مگر یہی پریشانی بیچ میں آکے پڑ جاتی ہے۔ کہ زوبی جاہل مطلق ہے۔ الف کا نام لٹھ نہیں جانتی۔ اور وہ ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ سوال ان کی پسند ناپسند کا بھی ہے۔ ساتھ میں ان کے والدین کی مرضی بھی ضروری ہے۔ سنا ہے کہ وہ لوگ بڑے اصول پسند ہیں ماں پکی دیہاتن ہیں۔ بھاری بھاری سونے چاندی کے زیور لمبا کرتا پہن کے گماشتوں کی عورتوں کے ساتھ مل کر چاول کوٹنے اور گھر میں مرچ مصالحے پیسنے والی بھاری بھرکم خاتون۔ اصلی مرضی اور پسند تو ان ہی کی ہے۔"

اماں کا پژمردہ چہرہ یکبارگی کھل اٹھا۔ "بیٹی اگر افتخار کی والدہ راضی ہو جائیں تو پھر اس کے گھر کا سیدھا سادا ماحول زوبی کے لئے بہت اچھا ہے۔ انھیں کے رنگ میں رنگ جائے گی۔ ایسے گھر میں جہاں تعلیم کا چرچا ہو۔ لڑکے لڑکیاں کالج کی ڈگریاں سمیٹے بیٹھے ہوں۔ وہاں اس کا گزر قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے دیہاتی ماحول ہی ٹھیک ہے۔"

"رضا بھائی کے کان میں یہ بات ضرور ڈال دو بھابی۔" عذرا نے کہا۔ "اماں کو اس کی بہت فکر ہے۔ بے چاری کی حماقتوں پر ایسے کوستی ہیں۔ کہ ان کے سامنے مر جائے۔"

"نہیں اماں اتنا بھی نہ گھبرائیے۔" شائستہ نے کہا۔ "میں ان سے ضرور کہوں گی۔ ہمیں بھی تو خیال ہے۔ لیکن یہ کام اتنی جلدی کا تو نہیں

سال چھ مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔

"ہتھیلی پر سرسوں تم بھی نہ جمانا بیٹی۔" اماں بھی اٹھ گئیں۔ "جلدی کا کام شیطان کا۔ سوچ سمجھ کر کرو جو کچھ کرو۔ اچھا۔ اب میں ذرا ابوا جی کا ہاتھ بٹا لوں۔ اکیلی بے چاری کیا کیا پکا ئیں گی۔"

آپ جا کے کچھ آرام کیجئے۔ دیر سے بیٹھی ہیں۔" عذرا نے کہا۔ "کھانے میں ابھی... دیر ہے۔ میں اور عذرا مل کے پکا لیں گے۔ سچ مچ اماں تو اپنے ہے فکریں ڈھونڈتی ہیں۔ پریشان ہونے کے لئے۔ جائیے جا کے لیٹ رہیئے!"

"اچھا میری بچی۔" اماں اپنی محبت کرنے والی بہو کو دعائیں دیتی چلی گئیں۔ عذرا اور شائستہ باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

زوبی نے ہارسنگھار کے پیڑ کے پیچھے "بستر" اندھیرے میں کھڑے ہو کر ان تینوں کی گفتگو سنی تھی۔ اور آج پہلی دفعہ اسے یوں لگ رہا تھا کہ الجھا دینے والے بکھرے بکھرے خواب بھی اپنی کچھ نہ کچھ تعبیر ضرور رکھتے ہیں۔ آج پہلی دفعہ انتظار کے تصوّر نے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ آج پہلی ہی دفعہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بڑی دور سے بڑی دھوم سے ایک بارات باجے بجاتی اس کے گھر کی طرف آ رہی تھی۔

سردی چمک اٹھی تھی مگر وہ گم صُم سی کتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی

راستے میں افتخار کو اپنے ملازم شیخ میراں سے علم ہوا کہ ان کے والدین شہر آئے ہوئے ہیں۔ اور رائل ہوٹل میں مقیم ہیں۔ اس اطلاع کے مبہم پہونچانے کے بعد اس نے کہا۔

"آپ نے کوئی خط لکھا تھا صاحب! اس نے گھر میں قیامت مچادی بڑے سرکار کے غصّے سے در و دیوار لرز اٹھے۔ بیگم صاحب کا حال بھی یہی تھا۔ آپ پر خوب۔ خفا ہو رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ اگر آپ نے ۔۔۔ معاف کرنا صاحب۔ ان کی بات کہہ رہا ہوں۔ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔"

"ہاں اور ــــــ" افتخار نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے پوچھا۔

"تو آپ کو جائداد سے بے دخل کر کے سب کچھ بڑے بھیّا اور چھوٹی بی بی کے نام کر دیں گے۔"

"دیکھتا ہوں میں بھی کیسے کر دیں گے!" افتخار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"مگر کیوں۔ صاحب؟"

"چل رہا ہوں نا۔ سن لینا سب کچھ۔ کب آئے یہ لوگ۔"

"آج صبح سات بجے۔"

"ٹھیک ہے۔ گھر کا پتہ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"آپ کے خط میں لکھا ہوا تھا۔ وہ مجھے لکھ کر دے دیا۔ راستے میں ایک ایک سے پوچھتا آیا۔"

"اب ان دونوں کے غصّے کا کیا حال ہے۔ کیا بڑے بھیّا بھی

آئے ہیں؟"

"وہ تو نہیں آئے صاحب! دوستوں کے ساتھ تلہر کے شکار پر گئے تھے۔ اور بڑے سرکار اور بیگم صاحب کے غصّے کا حال دیکھ رہے ہیں؟"

باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔ افتخار کا عجیب عالم تھا۔ کچھ غصّہ کچھ خوف۔ دل ہی دل میں سوال جواب کرتے اور اپنے دماغ کی تدبیریں سوچتے وہ بالآخر والدین کے حضور جا کھڑے ہوئے۔ بڑے سرکار افتخار کے والد خان بہادر مقصود احمد خاں ایک بڑی سی آرام کرسی پر نیم دراز اپنی جسامت کی مناسبت سے بڑا ہولناک سا سگار پی رہے تھے۔ اخبار دیکھ رہے تھے اور رہ رہ کر ایک کھنکار سی لگا رہے تھے۔

بیگم صاحب قیمتی ساری باندھے لمبی آستینوں کا اونچا سا کرتا پہنے اور بھاری بھاری زیور لادے مسہری پر دراز تھیں۔ ان کا چہرہ جو صحیح معنوں میں سرخ و سفید ہو رہا تھا۔ افتخار کو اپنے سامنے دیکھ کے لال بھبوکا ہو گیا۔ وہ بھاری بھر کم بدن کے باوجود پھرتی سے اٹھ بیٹھیں۔ اور خان بہادر صاحب نے اخبار میز پر رکھ دیا۔

"آداب بجا لاتا ہوں۔" ایک سلام میں دونوں کو نپٹاتے ہوئے افتخار نے بظاہر بے پروائی اور کچھ بناوٹی حیرت سے کہا۔ "کیا بات ہے کسی خبر و اطلاع کے بغیر آپ کا یہاں کیسے آنا ہو گیا۔ کب آئے آپ ... کچھ ضروری کام ہے۔۔۔؟"

"... خان بہادر صاحب گرجے۔ "بتاتے ہیں ابھی کیا خاص

کام ہے۔"

افتخار دل ہی دل میں خدا سے مدد مانگتے کھڑکی کے پاس پڑی کرسی پر جا بیٹھے۔ اور اب بیگم صاحبہ نے اسٹارٹ لیا۔ اپنا جہازی پرس جو عمرو عیار کی زنبیل سے کم نہ تھا۔ کھولا اور افتخار کا لکھا ہوا خط نکال کر ان کے قدموں میں پھینکتی ہوئی بولیں۔

"یہ ہے ضروری کام۔ سن لیا۔ جیسے نپٹانے یہاں آئے ہیں۔ ہمارا پیسہ کوڑی پھوکٹ کا تو ہے نہیں کہ سیر سپاٹے کرتے پھریں۔ بیسیوں کام چھوڑ کے آئے ہیں۔ اب نگوڑی آگ لگی تعلیم آئیم کو دفن کر دو میں ہیں۔ اور بوریا بندھنا باندھ کے چلو ہمارے ساتھ۔ سوچا ہی تھا ہم نے شہر آ کے بے لگام ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جاؤ گے۔ سو وہی ہوا ہے۔ کیوں رہے ہوائی دیدہ۔ یہ کیا لکھا ہے خط میں؟"

"ٹھہر و بھئی صبر کرو۔" خان صاحب نے ہاتھ اٹھا کر بیگم صاحب کو روکا۔ "پہلے اس کی خیریت دریافت کر و پھر اپنا حال سناؤ۔ صبر و سکون سے اس معاملے پر بھی گفتگو کر لینا۔"

"نہ صبر نہ سکون۔ میرا دل ہی ایک ٹھکانے نہیں ہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ "گفتگو مجھے پرائے شہر میں اور اس سرائے میں بیٹھ کے نہیں کرنا ہے۔ میں تو آج ہی واپس جاؤں گی اور اسے بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ گفتگو تو گھر جا کے کرنا ہے۔ کوئی ایک بات تو ہے نہیں کہ کرلی اور سدھار گئے۔ مفت میں موٹر کا اتنا تیل نہیں پھونکا ہے۔ افتخار جا کے اپنا سامان لے آؤ۔ چلو ہمارے ساتھ۔ اب ہم تمہیں راہ سے بے راہ ہونے کے لئے یہاں نہیں چھوڑ سکتے۔"

"میں ابھی تک نہیں سمجھا کہ آپ کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے!"
افتخار نے حیرت کی اداکاری برقرار رکھی تھی "اور نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ
.... راہ سے ... راہ ہو چکا ہوں۔ میں تو حیران ہوں کہ آپ کے غصے
اور برہمی کا سبب کیا ہے۔؟"
"تمہارا یہ خط ہمارے یہاں آنے کا سبب بنا ہے۔ اور تم ہمارے
ساتھ چلو گے بھی۔ اسی وجہ سے" اب خان بہادر صاحب بھی
قفلِ ابجد کی طرح کھلے۔ "ہماری تو سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ آخر یہ تم نے
لکھا کیا ہے۔ اور اپنی خالہ زاد بہن سے اپنی رسم توڑ نا کیوں چاہتے ہو۔
کیوں لکھا ہے ... زبان انکار کہلا بھیجیں۔ یہ کچھ معمولی باتیں ہیں گڑیا
گڈے ... کھیل کہ جی چاہا کھیلا نہ جی چاہا گڑیا کو نوچ کے پھینک دی
میاں ہمارے ... کے والد کو۔ ان کی زبان سے ہم بھی پناہ مانگتے
ہیں۔ تمہارے تو وہ پرخچے اڑا کے رکھ دیں گے۔ ہنسی مذاق نہیں ہے
کسی کی لڑکی کو منگنی کی زنجیر میں باندھے رکھنا۔ اور پھر زبان ہلا دینا
کہ ہم نے منگنی توڑ دی۔ لڑکی کی عزت آبرو خاندان میں وہ جیسے ہوتی
ہے جب پر سب ... کرتے ہیں۔ اس کو انگشت نمائی رسوائی میں بدل
دینا لڑکی کو خودکشی کی راہ دکھانا ہے۔ خاندانوں میں کتنی خونی دشمنی
آ کے پڑ جاتی ہے۔ کچھ اس کا احساس بھی ہے کہ نہیں۔"
افتخار غصہ دلانے والے انداز میں ہنسے۔ "نکاح تک ٹوٹ جاتے
ہیں ابا جان۔ یہ منگنی کیا چیز ہے۔ یہ ایک فرسودہ سی رسم ہے۔ قانونی
اور شرعی اعتبار سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اور یہ تو اپنی
پسند کی بات ہے۔ آپ نے منگنی کردی تھی اپنی مرضی سے اپنے

پسند ہے لیکن وہ میری پسند نہیں تھی۔ سفینہ کو ہمیشہ میں زینت کی سی بہن سمجھتا رہا ہوں۔ اب جب کہ ——!"

"اب جب کہ کوئی راہ چلتی دیدے سے مٹکو مل گئی ہے۔ تو سفینہ کو بہن سمجھنے لگا ہے۔ سال بھر سے منگنی چلی آرہی ہے تبھی اسے بہن سمجھ کے انکار کیوں نہ کر دیا تھا؟" بیگم صاحبہ چیخنے لگی تھیں "یہ کچھ نہیں۔ نہ تیری کوئی اوقات مردے نکلے۔ نہ تیری بات کی کوئی اہمیت ہے۔ کچھ نہیں جانتی کچھ نہیں مانتی بس اپنا سامان لے کے آ رضا کے گھر سے اور چل ہمارے ساتھ۔"

"فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے امی جان۔" افتخار نے سرد آواز میں جواب دیا۔ "میں جس مقصد کے تحت یہاں آیا تھا۔ وہی پورا نہیں ہوا۔ مجھے اپنا مقالہ ٹائپ کروانا ہے۔ اسے وقت پر —— سپروائزری بورڈ کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اپنا کام نامکمل چھوڑ کے میں نہیں چل سکتا۔ ابھی میں ایک مہینہ یہاں اور رہوں گا۔"

"نہیں رہ سکتے تم یہاں ایک سنٹ بھی اور۔" خان بہادر صاحب دہاڑے۔ "لے کے آؤ اپنا سامان —— شیخ میراں ——؟"

"نہیں ہے۔ گیا ہے رضا اور شائستہ کو بلانے۔ میں نے بھیجا ہے۔" بیگم صاحب نے کھا جانے والی نظروں سے افتخار کو دیکھتے ہوئے کہا ——!

"لک۔ کیوں۔؟" گھبرا کر افتخار نے پوچھا۔ "رضا اور شائستہ بھابی کو کیوں بلایا ہے آپ نے۔ کیا سوچیں گے وہ لوگ۔"

"میں پوچھنا چاہتی ہوں ان سے۔" بیگم صاحب نے کہا "میں

کہ آخر یہ سارا معاملہ ہے کیا۔ شائستہ اور رضا کو آخر کوئی خبر کیوں نہیں ہے۔ اور خبر تھی تو مجھے کیوں نہیں بلایا۔ کہ آ کے دیکھو یہ نالائق یہاں آ کر کیا گل کھلا رہا ہے۔ ئے تو دونوں ذرا۔ آخر کچھ تو خبر رکھنی تھی انھیں —— یا اسے نامراد تو نے انھیں بھی کچھ نہیں بتایا —— بیگم صاحبہ کا غصہ تھا کہ آتش فشاں. گویا اُبل رہا تھا۔ بدحواس سی ہو رہی تھیں وہ۔

بیگم صاحبہ کا غصہ دیکھ کر وہ بولے۔

"ارے خدا کے واسطے امی جان۔ سچ مانئے کہ رضا اور بھابی بالکل بے قصور —— !"

"چُپ" بیگم صاحبہ ببر شیرنی کی طرح دہاڑی تھیں۔ کہ در و دیوار جھنجھنا اٹھے۔ انتخار دم بخود رہ گئے۔ پتہ نہیں بے چارے بے خبر رضا اور بھولی بھالی مخلص سی بھابھی کا کیا حشر کریں گی یہ پہاڑی بیگم —— خاں بہادر صاحب مارے طیش کے کروٹیں سی بدل رہے تھے۔ ادھر امی جان نے ا... ندان کھولا اور انوں پر زیب کتھا چونا گھسیٹنا شروع کر ... تھا۔ غصہ انھیں اُس قدر تھا کہ زبان بند ہو گئی تھی۔ ہانپ رہی تھیں۔ بدن میں زلزلہ پڑا تھا۔ انتخار کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ انھوں نے گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی کہ رضا نہ ملیں کہیں باہر چلے گئے ہوں۔ اور ایک ملازم کے ہمراہ شائستہ بھابی آنا گوارا نہ کریں۔ مگر اُن کی دعا فضا ہی میں تھی اوپر تک ابھی پہنچی نہ تھی کہ رضا

اور شائستہ دروازے سے داخل ہوتے دکھائی دیئے۔ افتخار کی جان لبوں پر آگئی۔ ٹھنڈے ہو گئے۔

شائستہ نے بڑی شائستگی سے دونوں بزرگوں کو سلام کیا اور جا کے اپنی بھتیجی خالہ اماں کے بازو سے چمٹ گئی۔ ان سے لپٹنے کے لئے ان کے بازو ناکافی تھے۔ رضا نے گویا مارے خوشی کے چیخ کر خالہ اماں اور خالو صاحب کو سلام کئے۔ اور خان صاحب کے قدموں میں پڑے اسٹول پر ٹک گئے۔

"حیران ہوں آپ لوگوں کو اس ہوٹل میں دیکھ کر۔" رضا نے کہا۔ "کیسے آنا ہوا۔ خالو صاحب آپ کچھ دبلے اور کمزور دکھائی دے رہے ہیں۔"

خالو صاحب چھ فٹ سے اونچے تھے۔ چالیس انچ سے زیادہ چوڑے۔ وزن بھی پانچ من سے کم نہ تھا۔ مگر مارے محبت کے وہ رضا کو بہت کمزور نظر آ رہے تھے۔ یہ انھیں خبر ہی نہ تھی کہ وہ خود ان کے عظیم الشان جثہ کے سامنے چوزہ بن گئے تھے۔

ایک گہری اور بھاری سانس لے کر خان بہادر صاحب نے کہا۔ "کیا بتائیں بیٹا۔ ہماری تقدیر ——!" اور دلدوز انداز میں گم صم ہو گئے۔ ترس کھانے کے قابل حالت تھی۔

"خالہ اماں! یہ کیسی غیریت برتی ہے آپ نے؟" اب کی شائستہ بولیں۔ "ہوٹل میں ٹھہری ہیں آپ۔ کیا ہمارا گھر نہیں تھا۔ بے شک وہ آپ کے قابل نہیں تھا مگر ہمیں تو خوشی اور عزت نصیب ہو جاتی۔ ایسی کتنی دیر رہنا تھا۔ جایئے میں آپ سے نہیں بولتی۔"

انھوں نے سخت نخرے سے رُخ پھیر لیا۔ خالہ اماں کے ڈبل روٹی نما گال کچھ متحرک ہوئے۔ پان کی کثرت سے سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اپنے پھولے پھولے انگوٹھوں سے لبریز ہاتھ سے شائستہ کا نرم و نازک چہرہ تھام کر اپنی طرف پھیرتی ہوئی بولیں۔ "سن بچی۔ خفا نہ ہو۔ تیرا گھر بھی یاد تھا اور سوچا بھی تھا کہ وہیں اتر پڑیں پھر خیال آیا کہ بس چند گھنٹوں ہی کے لئے تو رہنا ہے۔ اب کسی کو کیا تکلیف دیں۔ افتخار کو لے کر رات دس بجے چل دیں گے۔"

رضا اور افتخار نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شائستہ بھی چونکی تھیں۔

"افتخار کو لے کر" رضا نے افتخار کا اشارہ سمجھ کر پوچھا۔ "مگر کیوں خالہ صاحب؟ ایسی بھی کیا جلدی ہے کہ آپ خاص کر وہاں سے صرف انھیں لے جانے کے لئے تشریف لائے ہیں۔"

"ہاں میاں، ہے کوئی ایسا ہی خاص کام۔" خان بہادر صاحب نے گوبجدار کھنکھار کے بعد کہا۔ "ان کا ہمارے ساتھ چلنا بہت ضروری ہے۔"

شائستہ رضا سے زیادہ عقلمند تھیں۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ افتخار ہی نے کوئی گھپلا کیا ہوگا۔ مگر گھپلے کی تفصیل انھوں نے نہیں پوچھی بلکہ اپنی خالہ اماں کے تودہ نما کندھے پر اپنا بے وزن سر رکھتی ہوئی اور ٹھنکتی ہوئی بولیں۔ "نہیں خالہ اماں۔ میں کچھ نہیں سننے کی۔ آپ افتخار کو اپنے ساتھ لے جائیے یا کچھ بھی کیجئے مگر اس وقت تو میرے ساتھ میرے گھر چلئے۔ آپ کو لئے بغیر میں یہاں سے سرکوں گی نہیں۔ آپ تو مجھے اتنا چاہتی ہیں۔ کیا میری اتنی سی بات نہیں مانیں گی؟"

"بچّی ہمیں جلدی جانا ہے۔" انھوں نے چمکارا۔ "وہاں بھی بہت سے کام پڑے ہیں۔ اب تو ہمیں جانے دو۔ پھر کبھی آئیں گے۔ تو۔۔۔"
"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بچّوں کی سی ضد کرتی ہوئی بولیں۔ "اس وقت تو چلیے۔ پھر کبھی آئیے گا تو بہت دن رکھوں گی آپ کو۔ اب تو لے چلوں گی اپنے ساتھ۔" وہ دفعتہً رضا پر جھپک اٹھیں۔ "کچھ نہیں گے نہیں ہونٹ سیے بیٹھے ہیں آپ۔" پھر افتخار پر امنڈ پڑیں۔ "ہمارا گھر آپ کو بھی یاد نہ رہا تھا شاید۔"
"میں۔۔۔ مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں کہ۔۔۔" افتخار گھبرا کر ہکلائے۔
"میری بہ نسبت خالہ اماں تمھاری زیادہ سنیں گی۔" رضا نے کہا۔
"چلیے اٹھئے!" شائستہ نے خالہ اماں کا ہاتھ تھامے تھامے انھیں اٹھانے کی کوشش کی۔ ان کی ایک انگلی کو بھی ہلا نہ سکیں۔
"بی بی بات یہ ہے کہ بارش کے دن ہیں۔" خان بہادر صاحب نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن شائستہ نے کہا۔ "خالو صاحب ہم بھی شکر کے بنے نہیں ہیں۔ آئیے چلیے۔"
دونوں نے اپنی اپنی جگہ سے جنبش کی تھی۔ اور مختصر سا سامان اکٹھا کرنے لگے تھے۔ "یہ کیا کر رہی ہو۔؟" رضا نے دکھلا کر شائستہ سے مدھم سی سرگوشی کی۔
"حکمت عملی! آپ دیکھتے نہیں افتخار بھائی کا کچومر بن گیا ہے۔"
"ہماری گاڑی تو نیچے موجود ہے۔" خان بہادر صاحب بولے۔
"شیخ میاں یہ سامان ذرا نیچے پہونچا دو۔" بیگم صاحب نے کہا۔
وہ دونوں تو سخت مجبور ہو کر جانے پر تیار ہوتے تھے۔ رضا کے والدین

سے لیس شینڈ تک کی شناسائی تھی لیکن رضا کئی بار افتخار کی جاگیر پر جا چکے تھے۔ ایک دو دفعہ شائستہ بھی گئی تھیں۔ افتخار تو رضا کے دوست پہلے اور امیر احمد کے بعد کو تھے۔ خان بہادر صاحب، بیگم صاحبہ اور شائستہ پچھلی نشست پر تھیں۔ ڈرائیور کے پاس رضا اور افتخار تھے۔ اور راستے میں افتخار نے بہت چپکے چپکے رضا کو سارا قصّہ سنایا تھا۔ وہ سر ہلاتے رہے۔

گھر پر دونوں معزز مہمانوں کا رضا کے والدین اور بڑی بہن نے بہت گرمجوشی سے استقبال کیا تھا۔ ان کا تعارف اسی قدر کافی تھا کہ وہ افتخار کے والدین تھے۔ ان کے خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی لیکن سب محسوس کر رہے تھے کہ اگر وہ دونوں کچھ کھنچے کھنچے برہم سے تھے تو افتخار کی جھک بھی بند تھی۔

تین چار گھنٹے جیسے تیسے کٹ گئے۔ اس کے بعد رات کا کھانا ہوا اور خان بہادر صاحب نے اجازت چاہی۔ بیگم نے بھی بہ ایں درازی دو قار گویا پر تولے تھے۔

"کیوں جناب اتنی جلدی کیا ہے؟" رضا کے والد نے کہا۔ "کچھ ہمیں بھی میزبانی کا شرف بخشئے۔ کوئی آپ حضرات بار بار تو آتے نہیں یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ میاں افتخار کے ذریعہ آپ سے تعارف و ملاقات کی مسرت نصیب ہوئی۔ میری گزارش تو یہ ہے کہ کم سے کم ہفتہ بھر تو جناب غریب خانہ پر قیام فرمائیں۔ بڑی خوشی ہو گی۔ سچ کہتا ہوں۔"

"رک جاتے بھائی صاحب! مگر رکنا نہیں چاہتے۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔" خان بہادر صاحب نے اخلاقاً جواب دیا۔ "آپ سے

مل کر ہمیں بھی بڑی خوشی ہوئی۔ افتخار تو آپ سب کی شفقت اور اخلاص کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اب ہم نے بھی دیکھ لیا کہ بخدا خلوص ختم ہے آپ پر۔"

"اچھا بھیا تو اجازت ہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ پھر خشک لہجے میں افتخار سے بولیں۔ "لے آؤ سامان کہاں ہے۔ چلو ہمارے ساتھ۔"

"افتخار بھی جا رہے ہیں۔" رضا کے والد نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن کیوں۔ ابھی کل تک تو ان کا اب کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا تھیسس بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔"

"بس اتنی سی بات بہانہ بن گئی۔" اپنے بیٹے کے خلاف بیگم صاحبہ نے زہر اگلنا شروع کر دیا۔ ان کا خط جو وہ مرض جان بنائے ہوئے تھیں ایک بار پھر پرس سے نکالا اور رضا کے والد زیدی صاحب کو اپنا صدر ثالث مقرر کر کے خط ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور ایک خشمناک نظر افتخار پر ڈال کر بولیں۔ "پڑھ کر انصاف کیجئے کہ یہ شرافت ہے کوئی۔ مؤ اکمینہ پن لفنگوں کی سی حرکت۔ چھچھوروں کی چال۔ سمجھائیے اپنے بھتیجے کو جن کے اتنے گن گا رہے ہیں آپ۔"

زیدی صاحب نے خط مو ڑ کر واپس کرتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ میاں افتخار نے آخر منگنی توڑنے کی بات کیوں لکھ دی ہے؟"

"پسند آ گئی ہے کوئی ساتھ کی پڑھی حرّافہ۔" بیگم نے کہا۔

"امی جان!" بے ساختہ افتخار کے منہ سے نکلا۔ اور وہ بے خبر سی شائستہ کو دیکھنے لگے۔ بے چاری کو کچھ پتہ نہیں معلوم ہو گا تو کیا سوچے گی۔ وہ پریشان تھے۔

"اگر واقعی یہی ہے میاں!" زیدی صاحب نے کھانس کر کہا۔ "تو
بہت نامناسب بات ہے۔ تم شریف، معزز اور شریف ماں باپ کے
بیٹے ہو۔ خود بھی شریف، عالی ظرف اور تعلیم یافتہ ہو۔ اچھی طرح سوچ
سکتے ہو کہ اونچے گھرانوں میں اس طرح کے معیوب واقعات بڑی ہی
رسوائی اور بدنامی کا باعث بن جاتے ہیں۔ لوگ لڑکی ہی کے چال چلن
پر حرف رکھتے ہیں۔ پھر ان کی شادی بیاہ کا مسئلہ نازک صورت اختیار
کر لیتا ہے۔"

"تو یہی کچھ کر نہ کہیے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ "سب سے پہلے تو مجھے
بد مزہ ہو گا۔ وہ میری سگی بہن کی بچی ہے۔ اسے میں نے پسند کیا ہے۔
... سال پہلے رسم ہوئی تھی۔ ہر عید بقر عید اور چھوٹی موٹی نذر نیاز پر
اس رسم کی تجدید کے لئے بہن اس نکھٹو بے غیرت کو کپڑے، شیرینی
مٹھائی بھجواتی رہتی ہے۔ یا... زیادہ اچھے کھانوں پر مر بھکوؤں کی
کی طرح گرتا ہے۔ ادھر بہن اس کے لئے دعوت کے لئے پکوانوں کا خوان تو ہر تقریب
پہ بھیجے آتا ہی تھا۔ میں سمجھتی نہیں کہ بے چاری بچی بھی اس خبیث
کو دوزخ یا نیچے کو اپنا سمجھ کر کیسے میں تقبل ستی بھی ہو گی۔ اس احسان
فراموش کے کچھ بھاویں نہیں بھائی صاحب! انصاف کیجیے بچی
کا معاملہ نازک ہوتا ہے!"

"واقعی بڑی نامناسب بات ہے۔ اُن کا منشا کیا ہے۔؟

"یہ ہم نہیں پوچھیں گے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ "یہ تو گھر چل کے
بابا جان اور ان کے بڑے بھائی پوچھیں گے۔"

افتخار کا چہرہ رہ رہ کر سرخ ہو رہا تھا۔ یہ باتیں کوئی سب کے

رسامنے کرنے کی نظیں۔ مارے غصّے کے ان کا بدن تپ رہا تھا۔ آنکھوں
سے آگ سی نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔

"خالہ اماں مجھے تو دکھائیے افتخار بھائی کا خط" شائستہ نے کہا۔
خط ان کے ہاتھ میں آیا اور پڑھ کر انھیں بھی بہت رنج سا ہوا۔ افتخار
نے واقعی بے ادبی اور گستاخی کی حد کر دی تھی۔

"امّی جان! تسلیمات عرض کرتا ہوں۔

آپ کا خط ملا۔ آپ سب کی خیریت معلوم کر کے اطمینان
ہو گیا۔ میں بھی اپنے دوست امیر احمد کے گھر پر مقیم ہوں بخیریت
ہوں میرا کام جاری ہے۔ امید ہے ہفتے عشرے میں پایۂ تکمیل کو
پہونچ جائے گا۔ بشرطیکہ آپ لوگوں نے مجھے اتنی مہلت دی
اور میرا دماغ خراب نہ کیا۔ امی جان! آپ مجھ سے بار بار
منگنی کی بات کر کے مجھے خوامخواہ کی ناپسندیدہ شادی پر مجبور
نہ کیجیے۔ میں آپ سے صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ
میں اب اس پرانی منگنی پر آمادہ و راضی نہیں۔ وہ سب فرسودہ
رسم محض آپ کی ضد پر ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں میری رائے
اور مرضی نہ آپ نے ملحوظ رکھی نہ ابا جان نے گویا میں بھی بے زبان
پردہ نشین لڑکی تھا۔ کہ جس کے ہاتھ میں میری تکمیل دے دی
گئی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ آئندہ مجھ سے اس قسم کی کوئی
بات نہ کی جائے۔ میری مرضی یہ ہے کہ وہ واہیات سی منگنی
فی الفور ختم کر دی جائے۔ میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔ اپنی پسند
سے کروں گا۔ ساری زندگی مجھے گزارنی ہے کسی اور کو نہیں

میرا مشورہ یہ ہے کہ منگنی کے شکنجے سے مجھے آزاد کیجئے
اور میرا عندیہ آپ اپنی ہمشیرہ محترمہ تک پہونچا دیجئے۔ وہ کسی
غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ میں اپنی طرف سے یہ رشتہ ختم
کرتا ہوں۔

سب کو سلام! فقط افتخار احمد"

خط ختم کر کے شائستہ افتخار کو دیکھنے لگیں۔ انھوں نے نظریں چرا لیں۔ کیا سوچیں گی یہ۔ اگر انھیں معلوم ہوگا کہ ان کا انکار ان کی حقیقی بہن کی محبت میں پوشیدہ تھا۔ افتخار دل ہی دل میں ایک شعلہ بار تقریر کر رہے تھے لیکن وہ دم بخود سے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں میں مختلف موٹی دبلی اور بھانت بھانت کی آوازیں پہونچ رہی تھیں لیکن وہ آوازیں کیا کہہ رہی تھیں۔ ایک لفظ بھی بامعنی ہو کر ان کی سماعت میں نہ گھس سکا۔

"تو کیا وہاں لے جا کر آپ ان کی شادی کر دیں گی؟" شائستہ نے پوچھا۔ اور کچھ ملول و دلگیر سی ہو گئیں۔ وہ افتخار کو سگے بھائی کی طرح چاہتی تھیں۔ ان سے افتخار نے اتنی اہم بات پوشیدہ رکھی تھی۔ پھر انھیں یاد آیا کہ ابھی کچھ ہی دیر قبل ان کی والدہ نے افتخار کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اور خود شائستہ نے بھی اس سلسلے میں ان کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔ اب افتخار ان کی پہونچ سے بڑی دور نظر آئے۔ وہ افسردہ تھیں۔ ان کی بات کے جواب میں بیگم صاحبہ نے کہا۔

"اور کیا؟ ایم۔ اے کر چکے ہیں۔ آگے پڑھنا ضروری نہیں۔ کون

سی ملازمت کرنی ہے۔ انتصار اکیلے زمینوں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ افتخار ان کا ساتھ کیوں نہیں دیتے۔ میں نے بھی اس بدمعاش کی سفارش کر دی تھی کہ آگے پڑھنا اور ڈاکٹر کہلوانا چاہتا ہے۔ تو وہ بے چارے چپ ہو گئے تھے

اب انہیں معلوم ہو گا کہ ایک شریف زادہ کسی اور مطلب کے لیے بہانہ بنا کر شہر بھاگ گیا ہے تو کیا کہیں گے۔ بی بی ہم ان کی شادی کر دیں گے۔ اور پھر یہ اپنے بھائی کے ساتھ جاگیر کا انتظام دیکھیں گے۔"

"مجھے دلچسپی نہیں ہے نہ زمین سے نہ جاگیر سے" افتخار نے منہ بنا کر کہا۔ "میں بھائی جان کے ساتھ کام کرنا بھی نہیں چاہتا! میں لیکچرر بننا چاہتا ہوں۔ اور میں بن کر رہوں گا!"

"صرف ایک صورت میں" بے حد سرد مگر خوفناک انداز میں خان بہادر صاحب نے کہا۔ "یا تو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔ یا تم میری ساری جائیداد میں اپنے حصّے سے دستبرداری کا کاغذ لکھ دو۔"

"ابھی اور اسی وقت لکھے دیتا ہوں ابّا جان!" افتخار نے کہا۔ "آپ کے سائے سے میں محروم ہونا نہیں چاہتا۔ لیکن آپ کی ساری دولت سے میں دستبردار ہوتا ہوں۔ جو آپ لکھوانا چاہتے ہیں لکھ دوں۔"

"افتخار!" زیدی صاحب گرجے۔ "یہ کیا گستاخی ہے۔"

"چچا میاں میں بھی مجبور ہوں" افتخار نے جواب دیا۔ "یہ شادی نہیں کر سکتا۔"

زیدی صاحب خاموش ہو گئے۔ دوسروں کے معاملے میں دخل

نہیں دے سکتے تھے۔ افتخار کے جواب میں ان میں لڑائی شروع ہو گئی۔ نہ تو خان بہادر صاحب خاموش ہوئے نہ تو افتخار۔ بالآخر بیگم صاحبہ آنسو بہانے لگیں۔ ماں کے آنسوؤں سے بھی افتخار نہیں پسیج سکے۔ وہ اٹھ کر برآمدے میں نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد زیدی صاحب نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا جناب کہ اگر آپ سب نے جبراً افتخار کو اپنی پسند کی شادی پر مجبور بھی کیا تو ان کی آیندہ زندگی خوشگوار گزر سکے گی۔ مار سے باندھے کا سودا تو ٹھیک نہیں۔"

"آپ روئیے نہیں خالہ اماں۔ میں انھیں سمجھاؤں گی۔" شائستہ نے کہا۔ "میری بات مانتے ہیں۔" شائستہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس جھگڑے اور ضد کی بنیاد ان کی بہن کی محبت میں پوشیدہ ہے۔

"کیا سمجھاؤ گی۔ بیٹی۔ وہ شروع کا ضدی ہے۔ اپنی بات ہر حال میں منوا کر رہتا ہے۔ بچپن میں بھی یہی حال تھا۔ جس کھلونے کے لئے مچلا۔ بس لے ہی کے دم لیا۔ چاہے بعد کو خود ہی توڑ پھوڑ کے پھینک دے۔ خیر۔ تمھارا کہا سہی۔ جاؤ سمجھاؤ۔"

بزرگوں کو گفتگو کرتے چھوڑ کر شائستہ اور رضا باہر نکلے۔ افتخار بے حد مشتعل اور برہم نظر آرہے تھے۔ انھوں نے مڑ کر ان لوگوں کو دیکھا اور پھر چہرہ پھیر لیا۔

"یار ہم سے کیوں خفا ہو۔" رضا نے ہنس کر کہا۔ "ہم کچھ نہیں کہہ رہے بابا۔"

"افتخار بھائی۔ اس طرح ضد کرنا اچھی بات نہیں۔" شائستہ نے کہا۔

"آپ سن رہے ہیں۔ خالہ اماں کس طرح رو رہی ہیں۔ ان کے آنسو کیوں سمیٹ رہے ہیں آپ؟"

"زبردستی کے آنسو ہیں یہ بہن؟" افتخار نے بے حد تلخ لہجے میں کہا "یوں ضد کر کے کسی کو محض اپنی خوشی کی خاطر مصلوب کرتے بھی کسی کو نہیں دیکھا۔ عجیب ہوتے ہیں۔ یہ ماں باپ اپنی انا پر اولاد کو بھینٹ چڑھانے والے۔

اپنی مرضی اور پسند پر اولاد کی خوشی کو قربان کرنے والے میں پوچھتا ہوں۔ کیا آرزو تمنا اور خواہش کرنا انھیں کا حق ہے۔ میرا نہیں۔ جس چیز کے لئے وہ ضد کر رہے ہیں مچل رہے ہیں۔ کیا میں ضد نہیں کر سکتا۔ مچل نہیں سکتا۔ کیا میرا دل کسی چیز کو نہیں چاہ سکتا ہے؟"

"تم جو کچھ کہتے ہو سب ٹھیک ہے۔ مگر بعد از وقت ہے"۔ رضا نے سمجھایا۔ "پہلے ضد کر کے مچل کے اپنی خواہش پر جمے رہتے تو بات اتنی دور تک نہ پہنچتی۔ اب تو تمھاری خواہش ایک ناکردہ کار لڑکی کی بدنامی کا باعث بن رہی ہے۔ اس پر کتنا ناگوار اثر پڑے گا۔ ٹھنڈے دل سے سوچو!"

"اچھا یہ بتایئے ہے کون وہ لڑکی ہے جس کی خاطر آپ اپنی منگنی توڑ رہے ہیں؟" شائستہ نے پوچھا۔

"بتا دوں صاف صاف"۔ افتخار نے شائستہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"بتایئے۔ مگر دھمکایئے نہیں"۔ شائستہ بولیں۔

"وہ ہے آپ کی بہن زوبی۔" افتخار نے کہا۔ اور شائستہ کی سانس رک گئی۔ افتخار کو تکتی رہ گئیں۔ رضا بھی حیرت سے افتخار کو دیکھنے لگے۔ افتخار نے کہا۔ "مجھے وہ شروع سے اچھی لگتی ہے۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ بس اسی کا حصول میری زندگی کا مقصد ہے۔ میں امی جان کی بھانجی سے کسی حال میں کبھی شادی نہیں کر سکتا۔"

"افتخار بھائی! کیا آپ خالو صاحب اور خالہ اماں کو میرا دشمن بنانا چاہتے ہیں؟" شائستہ نے حیرت کے صدمے سے سنبھل کر ملامت خیز لہجے میں کہا۔ "وہ لوگ میری صورت پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کریں گے۔ یہی سوچیں گے کہ میں نے اپنی بہن کا ٹھکانہ لگانے کے لئے آپ کو بہکایا بھڑکایا ہے۔ اسی لئے آپ کو اپنے میکے میں ٹھہرایا ہے۔ زوبی بیچاری بدنام ہو گی۔ اماں پر اس کی بدنامی کا بڑا شدید اثر ہو گا۔ انھیں کچھ ہو گیا تو پھر کیا ہو گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو سوچئے کہ زوبی نیٹ جاہل ہے۔ بدتمیز ہے۔ بدسلیقہ اور زبان دراز ہے۔ آپ کا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ خدا کے واسطے اپنی بے جا ضد سے باز آیئے۔ ہم سب پر رحم کیجئے۔ بہت برا کر رہے ہیں۔ آپ۔ آ۔"

"تم بڑھتے گدھے ہو۔" رضا نے ڈانٹا۔ "افتخار یہ پاگل پن چھوڑو۔ شائستہ سچ کہتی ہیں۔ ہم سب بدنام ہو جائیں گے۔ زوبی پر بات آئے گی کہ اس نے تمھیں لبھایا ہے کیا ایک رکیک الزام تم زوبی پر برداشت کر سکتے ہو کسی کو چاہنے کا مطلب یہ کہاں ہے کہ ۔۔ آ"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" بڑی ڈھٹائی سے افتخار بولے۔ "شروع شروع میں مجھ سے بھی بارٹ فیل ہونے لگیں گے لیکن اس ڈر سے میں

اپنی جائز آرزو سے دستبردار ہو کر ماں باپ کے جبر کی پھانسی پر تو نہیں چڑھ سکتا۔ اپنی زندگی میں اپنی مرضی سے گزارنا چاہتا ہوں میں اپنے مسائل اپنے ماں باپ سے وابستہ کرنا پسند نہیں کرتا۔

"تو یہ تمہارا قطعی فیصلہ ہے۔" رضا نے کہا۔ پھر بولے۔ "فرض کرو کہ اماں نے تمہاری درخواست منظور نہ کی تب یہ تمہارا احتجاج۔ ماں باپ کی نافرمانی یہ سب حرکتیں بے معنی ہو جائیں گی۔" "لیکن یہ تمہارا مفروضہ ہے۔ افتخار نے شکست قبول نہ کی۔" ابھی میں نے اماں سے کچھ کہا نہیں ہے۔ فرض کرو۔ اماں نے میری درخواست مان لی تب!"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" رضا نے کہا۔

"آپ ہمیں بدنام و رسوا کرنا چاہتے ہیں۔" درشت لہجے میں شائستہ نے کہا۔ "میں اماں کو منع کر دوں گی کہ آپ کی درخواست قبول نہ کریں۔ آپ کا یہی علاج ہے۔ دوسری طرح تو آپ مانیں گے نہیں۔"

"زوبی کے حق میں کانٹے نہ بو بہن۔" افتخار نے کہا اور مڑ کر دونوں ہاتھ شائستہ کے کندھوں پر رکھ دیئے۔ "تمہیں بخوبی علم ہے کہ زوبی کسی گھر میں خوش نہیں رہ سکتی۔ اس کی فطرت عجیب ہے۔ اسے صرف میں ہی سمجھ سکا ہوں۔ میں بہتر طریق سے ہینڈل کر سکتا ہوں۔ میں اسے خوشیاں آرام اور دنیا کی ہر راحت دے سکتا ہوں۔ اگر اب بھی میری نیت پر تمہیں شبہ نہ ہو۔ میرا جذبہ تمہیں خالص نہ لگتا ہو۔ زوبی کی بھلائی۔ اس کا خوشگوار مستقبل تمہیں گوارا نہ ہو تو ضرور جاؤ اور اماں کو منع کر دو! پھر اس کی قسمت اور میری تقدیر۔ پر میں لکھ کے دئیے دیتا ہوں کہ زوبی اپنی عادتوں کی بنا پر کہیں مطمئن زندگی نہیں گزار سکے گی

وہ صرف میرے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔ اور بس۔ آگے تمہاری مرضی اب میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اگر اماں نے میری درخواست نامنظور کر دی تو میں چلا جاؤں گا۔ اور امّی جان کی مرضی پوری کر دوں گا۔ سچ ہی تو ہے۔ یہ یکطرفہ لڑائی میں اپنے ماں باپ سے کیوں لڑ رہا ہوں۔ مجھے تو علم ہی نہیں کہ اماں کی کیا مرضی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر مڑ گئے اور باہر دیکھنے لگے۔ شائستہ نے دیکھ لیا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے رضا اور شائستہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

خان بہادر صاحب نے زیدی صاحب کی درخواست پر ان کے ہاں مزید دو تین دن قیام کرنا منظور کر لیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے بھی اس میں مصلحت دیکھی تھی۔ یہاں افتخار کم سے کم ان کی نظروں کے سامنے تو تھے۔ گاؤں جا کے کرنا کیا تھا۔ مگر وہ اس قدر پریشان تھیں کہ شیخ میراں کو بھیج کر اپنے بڑے صاحبزادے انتصار احمد کو بھی بلوا لیا۔ ان کی آمد پر افتخار کا جی چھوٹ گیا۔ انتصار احمد اپنے باپ سے آتش مزاجی میں دس ہاتھ آگے تھے۔ لوگ ان سے بات کرتے ڈرتے۔ اور اگر وہ کسی سے مخاطب ہو جاتے تو سامنے والا لرزہ براندام رہتا۔ انھیں ہنستے مسکراتے ہوئے بھی لوگوں نے بہت کم دیکھا تھا۔ دو دو چار کی بات کرتے تھے اور بس۔ لیکن صرف ایک وصف ان میں ایسا تھا کہ ان کے دوسرے سارے عیوب کو ڈھک لیتا تھا۔ وہ بڑے انصاف پسند فیاض

اور وسیع الظرف تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر کوئی ان کے تن سے کپڑے بھی طلب کرتا تو وہ اتار کے مانگنے والے کو دیدیتے۔ افتخار نے سلام کی حد تک ان کا سامنا کیا۔ اور پھر اس طرح جا کے اپنے کمرے میں چھپ گئے کہ دیر تک کسی کے سامنے نہ آئے۔

ان کے پاس رضا اور شائستہ بھی نہیں آئے۔ رضا اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اور شائستہ اس لئے چوپ کر رہ گئیں تھیں کہ معاملہ ان کی بہن کا تھا۔ اور ابھی تک خاں بہادر صاحب یا ان کی بیوی کو اس کا علم نہ تھا۔ انھیں دہشت سی تھی۔ معلوم ہوگا۔ تو کیا ہوگا۔ اکیلے میں انھوں نے رضا سے کہا۔ "یہ افتخار بھائی نے کیسی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ایسے بد نظر بد نیّت آدمی ہیں تو انھیں بھیّا کے گھر کبھی نہ بھیجتی۔ ابا تو اماں سے کہہ دیتے کہ زدبی کو ان کے سامنے نہ کریں۔ مگر شامت بھی کہ وہی نامرادان کے سارے کام کرتی تھی۔ معلوم نہیں کہ اس کم بخت سے کیسے رومانی ڈائیلاگ بکے ہیں۔ گھنی سکار نے مجھ سے بھی کچھ نہیں کہا۔

"ایسی باتیں کیا کسی اور سے بھی کہی جاتی ہیں۔" رضا نے کہا۔ "مگر میں تو سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ جب امّاں کو اس جھگڑے کی خبر لگے گی تو کیا ہوگا۔"

"امّاں کو تو الگ رکھئے اب بڑے بھیا آئے ہیں۔ ان سے نپٹنے کی سوچئے۔" شائستہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "میں تو ان کی طرف ہی دیکھتے ڈرتی ہوں۔ ایسے کیسے بھوت بنے رہتے ہیں کہ آدمی بات کرتے مرنے لگے۔ انھیں پتہ چلے گا۔ افتخار صاحب نے صرف میری بہن

کی وجہ سے پرانی منگنی توڑنے پر ضد کی ہے تو خدا معلوم وہ کیا کہیں گے۔ آپ نے سنا نہیں خالہ اماں۔ محض قیاس ہی پر اس لڑکی کو حرافہ دیدے مٹکو بنا رہی تھیں۔ خدایا۔ میری تو دھجیاں اڑا دیں گی وہ۔"

میری بھی۔" رضا نے تیزی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "پوچھیں گی۔ ہر دفعہ میں افتخار کو اپنے ہاں ٹھہراتا تھا۔ اب کی امیر کے ہاں کیوں بھجوا دیا۔ یہ عذر بھلا وہ کیا سنیں گی۔ کہ ادھر کا کمرہ گرا کے اب ہم وہاں ہال تعمیر کرانا چاہتے ہیں۔ صاف کہہ دیں گی کہ یہ سوچی سمجھی اسکیم تھی پھر کیا جواب ہو گا ہمارا۔ ارے اس افتخار کے بچے کو خدا غارت کرے۔ یہ ہوسٹل ہی میں پڑا رہتا تو اچھا تھا۔ میں اس ناشدنی خبیث کو تمہارے گھر لے ہی کیوں گیا تھا۔ مگر اب سر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"زدبی جیسی کندۂ ناتراش ہیں افتخار صاحب کو کیا خوبی دکھائی دی۔" شائستہ نے حیرت سے کہا۔ "لاکھ وہ میری بہن ہو مگر میں حق بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

رضا پریشان تھے۔ خاموش رہے۔ شائستہ بھی کچھ سوچنے لگیں۔
انتصار احمد سے خان بہادر صاحب اور بیگم صاحبہ نے سارا قصہ کہہ دیا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے اور جب ان کی والدہ خاموش ہو گئیں تو انھوں نے انتہائی سنجیدہ اور گمبھیر آواز میں پوچھا "جو کچھ آپ کو افتخار سے کہنا سننا تھا۔ آپ کہہ سن چکے ہیں۔"
"سب کچھ۔" بیگم نے پھنکار کر کہا۔

"اب میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔" انتصار احمد نے کہا۔ دونوں منتظرانہ انداز میں انھیں دیکھنے لگے۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اگر جبراً افتخار کی شادی کر بھی دی تو کیا وہ اپنی زبردستی کی بیوی کے ساتھ خوش بھی رہ سکے گا آپ کو معلوم ہے کہ ابھی مہینہ بھر قبل طاہر نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ بدعت میرے گھر میں بھی پاؤں جمائے۔ کسی لڑکی پر طلاق کا کلنک لگنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اسے ناپسندیدہ شادی کے شکنجے میں جکڑا ہی نہ جائے۔ میری رائے تو یہی ہے کہ اپنی مرضی افتخار پر مسلط کرنے کے بجائے اس کی مرضی پوچھئے۔ اور وہی کیجئے جو وہ چاہتا ہے۔"

دم بخود رہ جانے کے بعد بیگم صاحبہ نے کہا۔ "واہ میاں یہ الٹی گنگا کیسی؟ تمھیں تو بلایا تھا کہ تم اسے سمجھاؤ گے نہ کہ تم۔۔۔!"

"زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اور زندگی اسے گزارنی ہے۔۔۔"

انتصار احمد نے انصاف کر دیا۔ "نہ مجھے نہ آپ کو۔ اگر وہ شادی کے بعد خوش نہ رہا۔ تو بتائیے کیا آپ خوش رہ سکیں گی۔ اپنے گھر میں روز کے ناخوشگوار جھگڑے برداشت کریں گی۔؟ اس سارے معاملے کا بہترین نتیجہ وہی ہے۔ جو میں نے نکالا ہے۔ آپ نے افتخار سے پوچھا ہے کہ وہ منگنی سے بیزار کیوں ہوا ہے؟"

"وجہ اس نے کہاں بتائی ہے۔؟"

"بلائیے اسے میں پوچھتا ہوں۔"

افتخار بڑے بھائی کے سامنے اس طرح آئے کہ بڑے سے بڑا

مجرم بھی جج کے سامنے اس طرح نہیں جاتا۔ بدن سرد۔ لرزہ بر اندام، چہرہ نیلا سفید، ہونٹ خشک، زبان سوکھی، نیم مردہ —
انتصار احمد نے بے حد سرد لہجے میں پوچھا۔ "تم نے اچھی طرح سوچ سمجھ کے خط لکھا تھا؟"

"جی —!"

"امی کی مرضی سے شادی پر راضی نہیں ہو؟"

"امی سے کہہ چکا ہوں۔"

"کوئی اور لڑکی ہے تمھاری نظر میں۔؟"

"جی۔"

"کون ہے؟" انتصار احمد کے لہجے کی سردی تھی کہ افتخار کپکپا رہے تھے۔ چپ ہی رہے۔

"جواب دو۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔" انتصار احمد گرجے۔

"جی ہاں۔"

"کیا جی ہاں۔" انتصار احمد گرج اٹھے۔ اب کی زیادہ زور سے گرجے تھے۔

"وہ — وہ — لل — لڑکی —!" افتخار احمد کا دم لبوں پر تھا۔
"بھبھ۔ بھابی کی بہن ہے۔ زبیدہ۔!"

"کیا۔؟" بیگم صاحبہ دنگ رہ گئیں۔ "زبیدہ۔ اشائنہ کی بہن زبیدہ۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ گھر گھار کے اس عقل کے اندھے کے ہاتھ بٹیر مکڑ پکڑا ہی دی۔ وہی تو میں کہوں کہ آخر یہ خط دارد

یہ مہمان نوازیاں بھلا اس کی کیوں ہو رہی تھیں۔ واہ بیوی۔ شائستہ تم نے بڑا کام کیا۔ ایک لڑکی کا صبر سمیٹا، خاندان میں دشمنی ڈلوائی کسی بے گناہ کی عزت پر کیچڑ اچھالی۔ اور اپنا الو سیدھا کر لیا۔
"خالہ اماں۔" شائستہ خود دروازے کی آڑ میں کھڑی اس بم کے پھٹنے کی منتظر ہی تھیں۔ وہ آکے بیگم صاحبہ کے قدموں کے پاس بیٹھ گئیں۔ اور ہاتھ جوڑ دئیے۔ "خالہ اماں ـــ میں اپنے مرحوم باپ کی قسم کھاتی ہوں مجھے تو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ یہ تو ابھی بات چیت کے دوران انھیں معلوم ہوا ہے۔ آپ مجھ سے حلف اٹھوا لیجئے کسی نے افتخار بھائی کو نہیں بہکایا ـــ نہ کسی نے ـــ!"
"صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں شائستہ۔" انتصار احمد نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم سچ ہی کہہ رہی ہو۔ اب مجھے بتاؤ۔ اس معاملہ کا علم تمہاری والدہ محترمہ اور بڑے بھائی کو ہے کہ نہیں؟"
"جی ـ بالکل نہیں۔" شائستہ ذلت اور شرم کے مارے رونے لگی تھیں۔
"انتصار!" خان بہادر صاحب نے برہم ہو کے کہا۔ "تم تو کچھ اور ہی اسکیم بنا رہے ہو۔ میاں آخر اس لڑکی کے بارے میں بھی تو سوچو جو اس کے نام سے وابستہ ہے۔ کیا کہیں گے بھائی امتیاز الدین ان کی عزت کو ہم نے کھیل سمجھ رکھا ہے۔ دو سال پرانی منگنی توڑنا کوئی معمولی بات ہے۔؟"
"امتیاز الدین صاحب کے سامنے جب یہ سارا قصہ رکھا جائے گا تو وہ خود بھی اپنی لڑکی کو جیتے جی جہنم میں جھونکنا پسند

نہ کریں گے۔" انتصار احمد نے کہا اور دفعتہً مڑ کر زیدی صاحب کو ہمنوا بنا لیا۔

"فرمائیے قبلہ۔ میں ٹھیک کہتا ہوں کہ نہیں۔ جبر کا سودا کبھی... پسندیدہ رہا ہے۔" زیدی صاحب بوکھلا کر چپ رہے۔ انتصار احمد اٹھ کھڑے ہوئے۔ "شائستہ ہمیں اپنے گھر لے چلو۔ میں تمہاری والدہ صاحبہ اور بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ دونوں بھی چلیں گے۔" انھوں نے اپنے والدین سے کہا۔

"کیوں؟" شکست خوردہ سے خان بہادر صاحب نے پوچھا۔ بیگم صاحبہ بھی حق دق ہو کر انتصار احمد کا منہ تکنے لگیں۔

"اس لئے جو کچھ ہونا ہے وہ ہو جائے ہمیں اس ضیق النفس سے اور انجانہ کو ایک الجھن سے نجات ملے۔" انتصار احمد تو بس کھڑے ہی ہو گئے۔ افتخار احمد پر گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا تھا لیکن ہوا دہی جو آمرانہ ذہنیت رکھنے والے غصہ ور انتصار احمد نے سوچا تھا... انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ آخر افتخار بھی کسے سے ضدی شخص کے بڑے بھائی تھے۔ ان میں خودرائی، سرکشی اور من مانی کے جراثیم کچھ زیادہ ہی تھے۔

شائستہ اپنی ماں کی مزاجی کیفیت کا خیال کر کے سہمی جا رہی تھیں۔ کوئی معمولی سی بات بھی ان کے اختلاج کے لئے کافی تھی۔ ڈپریشن کے دورے انھیں یونہی بے جان کر کے رکھ دیتے تھے۔ پھر اب یہ سارا قافلہ جو غضبناک اور بپھرے ہوئے غازیوں پر مشتمل تھا۔ اماں کو منہ بھی کھولنے دے گا کہ اپنے دفاع میں وہ کیا کریں گی۔

شائستہ گھگھیائیں۔ "بھائی جان ذرا توقف کیجئے! پہلے میں جا کے اماں اور بھیا کو صورت حال سے واقف کرا آؤں۔ پھر آپ چلیئے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی بیچارگی آپ ان سے یہ غیر معمولی خلاف توقع باتیں کرنے لگیں گے تو ان کا مزاج زیادہ بگڑ جائے گا۔ پہلے آپ مجھے اجازت دیجئے۔ میں پہلے جاؤں۔"

"تم نے مجھے اتنا بد تہذیب اور بدمزاج سمجھا ہے۔" انتصار احمد کو غصہ خرید نے کہاں جانا تھا۔ انھوں نے ایک گھڑکی میں شائستہ کو خاموش کر دیا۔ "میں انسان ہوں۔ جانور نہیں۔ میں خود ان تجربہ کے سامنے صورت حال رکھوں گا تم سے بہتر انداز میں سمجھا سکوں گا۔ ہاں۔ امی جان آپ اور ابا جان۔ براہ کرم اب اٹھئے۔ جلد اس مسئلے سے نپٹ لیں۔ میں بہت ضروری کام چھوڑ کے آیا ہوں۔ زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔"

"مجھے معلوم ہوتا کہ تم اسے باجی کی گاڈ گے تو میں تمھیں نہ بلاتی۔" بیگم صاحبہ کا غصہ کسی طرح دھیما ہونا ہی نہ تھا۔

"اچھا تو اب جاتا ہوں۔" انتصار احمد نے بے حد خشک لہجے میں کہا۔ "آپ جائیں اور یہ جانے۔ لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ بعد کو اپنے گھر میں میں کسی قسم کی تو تو میں میں یا ناخوشگوار باتیں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ اجازت دیجئے!"

"ٹھہرو تو میاں!" نعمان بہادر صاحب جو کسی حد تک سہ تا قبل ہی جھانک ہیں کا کے بھڑ گر بڑا کر بولے۔ "ہم چل رہے ہیں۔ یہی فیصلہ بہتر ہے جو تم نے کیا ہے۔ بعد کو فضول جھگڑوں سے کیا حاصل۔"

شائستہ!" انتصار صاحب نے حکم دیا۔ "تمھیں چلنا ہے ہمارے ساتھ"!

"جی اچھا" شائستہ کے منھ سے مری ہوئی آواز نکلی۔
افتخار بدحواس ہو رہے تھے۔ ایک ایک کو دیوانوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔ لیکن نہ ان کی طرف کسی نے توجہ کی نہ ان کی کسی نے کچھ سنی!۔

انتصار صاحب معزالدین اور شائستہ کے چلے گئے!۔ ادر ادھر رضا نے افتخار کے بخئیے ادھیڑنے شروع کر دئے۔ ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ افتخار کو رلا دیا۔ لیکن کیا مجال کہ دھن کا پکا آدمی اپنے موقف سے بال برابر بھی ہٹا ہو۔ پھر رضا اپنی سسرال میں برپا جنگ زرگری کا تماشہ دیکھنے کے لئے چلے گئے۔ وہ خاصی دیر سے پہونچے تھے۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ گویا دونوں فریقین کسی قسم کے سمجھوتے پر راضی ہو چکے ہوں۔ امیر احمد جیسا کہ رضا کا خیال تھا۔ کہ سخت غصّے میں ہوں گے۔ وہ پرسکون دکھائی دیئے بلکہ کچھ مطمئن بھی تھے۔ خاں بہادر صاحب میز پر رکھے "تلے ہوئے کاجو" کبھی کبھار اٹھا کے کھا لیتے تھے۔ بیگم صاحبہ پان بنانے کے شغل میں محو تھیں۔ اور سب سے اہم ہستی یعنی اماں جنھیں اختلاج میں مبتلا ہونا چاہئے تھا۔ بیگم صاحبہ کے پاس ہی بیٹھی خاصی مطمئن اور مسرور دکھائی دیں۔ ایک انتصار احمد تھے کہ اب بھی ہونٹ پر ہونٹ چپکائے تصویر کی طرح خاموش بیٹھے تھے۔
دفعتہً رضا کی نظریں امیر احمد کی بیوی عذرا پر پڑیں جو ایک بڑے

دروازے کی آڑ میں چھپی کھڑی اشارے سے رضا کو بلا رہی تھیں
رضا کچھ کھانسے اور جب کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ تو وہ
اٹھ کر چلے گئے۔ عذرا نے منہ پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا
اشارہ کیا۔ اور پھر آنکھیں نکال کر بولیں۔

"رضا بھائی یہ چھو منتر آخر ہوا کیا ہے۔ وہ کون بڑے تازے اور
جنگجو صاحب ہیں۔ جنھوں نے اماں کو ایک دم شیشے میں آتار لیا ہے میں
حیران ہوں۔ انھوں نے اماں سے ایسی پکی پختہ اور معقول باتیں کی ہیں
کہ اماں زوبی کو ان کے دینے پر آمادہ ہو گئی ہیں۔ کون ہیں یہ صاحب!"
"افتخار میاں گدھے نا ہنجار کے برادر معظم جناب انتصار احمد صاحب"
رضا نے چپکے سے ہنستے ہوئے کہا۔" انھوں نے افتخار کی نیا پار
لگائی ہے۔ اور بقول اماں کے ہماری زوبی کا بیڑہ بھی ساحل مراد پر
پہونچا دیا۔ یہ کہیے۔ شادی کی بات طے ہو چکی!"

مزید آنکھیں پھیلا کر اور حیرت کی زیادتی سے پاگل ہو کر عذرا
نے کہا۔" آپ طے ہو جانا کہتے ہیں۔ ارے شادی تو کل ہی ہے۔!
جمعہ کے دن بعد مغرب نکاح۔ یا خدا میں تو جیسے کوئی خواب دیکھ رہی
ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ زوبی جیسی احمق اور کودن لڑکی ایسی
زبردست سسرال اور ایسے بھاری بھرکم لوگوں کے بیچ کیسے رہے
گی۔ رضا بھیا یہ کوئی بری بات تو نہیں ہو رہی ہے۔ اماں تو خوش ہیں
کہہ رہی تھیں کہ زوبی کی تقدیر کھل گئی ہے۔ ایسا اچھا رشتہ اسے
کہاں ملتا۔"

"ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ مگر اتنی بھی عجلت ہے" رضا نے کہا۔" یعنی

کل رہی۔ اماں نے پوچھا نہیں کہ اتنی جلدی کاہے کی ہے"۔
"امیر صاحب نے پوچھا تھا۔" عذرا بولیں۔ "انتصار صاحب نے عذر پیش کر دیا کہ وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔ بار بار یہاں آ نہیں سکتے۔ لہٰذا ایک بات جب طے ہو ہی چکی ہے تو اس کی انجام دہی میں خواہ مخواہ کی تاخیر کیوں کی جائے۔ امیر صاحب نے ہزار کہا کہ ابھی لڑکی کے لئے کپڑے زیور برتن اور فرنیچر کی قسم کی کوئی بھی چیز تیار نہیں ہے مگر انھوں نے ان کی ایک نہ سنی۔ کہنے لگے کہ انھیں لڑکی کے سوا نہ ایک دھجی کپڑے کی چاہیئے نہ ایک تار زیور کا۔ نہ میز کرسی نہ پلنگ الماری۔"
"بھئی واہ۔ ایسے سیر چشم عالی حوصلہ اور فیاض لوگ بھی نہیں دیکھے"۔ رضا نے کہا۔ "دراصل زوبی ان سب کو بے حد پسند آئی ہے!" عذرا نے کہا۔ "ممانی تازی خالہ کہہ رہی تھیں کہ چاند کا ٹکڑہ ہے صورت بھی بہر تو لٹو ہو گئی ہیں۔ سچ بچ بہن اوڑھ کر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ چاند کی سی"۔
"بس خدا کرے یہ ٹکڑہ ان کے گھر میں اجالا پھیلا سکے" رضا نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "میں تو بہن اس طرح کی شادی کے سخت خلاف ہوں۔ کہ کوئی ترس کھا کے ہمدردی جتا کے اور کسی کو مظلوم سمجھ کے صرف لڑکی کو سمیٹ لے جائے۔ امیر سے میں کہوں گا۔ جو کچھ ہو سکتا ہے فراہم کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ اچھا چلتا ہوں۔ کچھ فرض میرا بھی تو ہے ابھی کافی وقت ہے۔ غور سکیں کر لیں"۔
بہر حال وہی ہوا جو انتصار کی مرضی تھی ان کی درخواست سن کر

اماں پہلے تو بھونچکا رہ گئیں۔ لیکن انتصار احمد نے سنجیدگی سے واضح کیا کہ یہ مذاق نہیں۔ افتخار اگرچہ کہیں ملازم نہیں ہے لیکن ملازمت کی اسے ضرورت بھی نہیں۔ وہ زوبی کو ہر طرح آرام سے رکھے گا۔ اس کے پاس بہت بڑی جائداد ہے اور پھر۔ اماں نے سوچا۔ زوبی کی سی جاہل مطلق لڑکی کا یہ رشتہ غیب سے اترا ہے۔ افتخار کا سا فرشتہ!

اماں نے پوری پوری ایمانداری سے بیگم صاحبہ اور انتصار احمد کو بتا دیا تھا کہ زوبی ان پڑھ تھی۔ زبان کی بدتمیز تھی۔ اسے کھانا پکانا سینا پرونا نہیں آتا۔ باپ کی دلاری تھی۔ اس لئے اٹھان کچھ غلط اٹھ گئی تھی۔

"آپ اس کی فکر نہ کیجئے!" انتصار احمد نے کہا۔ اس تمام عرصے میں وہ قسم کھانے کو بھی مسکرائے نہ تھے۔ مسکرانے کا سا چہرہ تک نہ بنایا تھا۔ ہنسنا تو ایک طرف رہ گیا!۔

پھر انتصار احمد اپنے والدین کے ساتھ رضا کے گھر آ گئے! افتخار کے نکاح کے بعد وہ لوگ اسی شام گاؤں روانہ ہونے والے تھے۔ افتخار نے اپنا نوشتۂ تقدیر سنا۔ خوش کم ہوئے۔ دھک سے زیادہ رہ گئے۔ انھیں دال میں بہت سے کالے نظر آنے لگے۔ کیا ہوگا آگے چل کر۔ والدین محترم کا سلوک کیسا رہے گا۔ بڑے بھائی بھاوج جو نہایت اعلیٰ طرز حیات کے عادی تھے۔ وہ ایک گنوار لڑکی کو نظروں میں چڑھا بھی سکیں گے۔ زوبی کی زبان۔ بد سلیقگی۔ بے پروائی ـــــ وہ سخت پریشان تھے۔

شائستہ میکے میں رہ گئی تھیں۔ امیر احمد کو گویا سکتہ سا ہو چکا تھا۔

رضا نے انھیں بھی صلواتیں سنائی تھیں۔ امیر احمد بے بسی سے بولے تھے "مجھے منہ کھولنے کا موقع بھی نہ دیا انھوں نے۔ کہنے لگے کہ افتخار ایک عرصے سے تمھیں جانتا ہے۔ میں اگر اس کا بڑا بھائی ہوں تو تمھارا بھی بڑا ہوں۔ بھائی ایک جانے تو مجھے گھر میں تمھاری بہن کو لے جانا اور اپنے خاندان میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ تمھیں اعتراض کیا ہے میں تو کچھ بول نہ سکا۔ بتاؤ کیا کروں؟"

"جب کچھ نہ کر سکے تو اب کیا کرو گے۔ بس یہ کرو کہ فوراً جمع پونجی نکالو میں بھی نکالتا ہوں۔" رضا نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "اور اب چلو بازار ۔۔۔ بھابی اور شائستہ کو لے لو ساتھ میں جو کچھ بھی کھڑے گھاٹ بن پڑے خرید لیں۔ سلے سلائے ملبوسات نیا نیا یا زیور۔ کیا؟ کتنی رقم ہے تمھارے پاس۔؟

"پانچ چھ سو پڑے ہوں گے۔" امیر احمد نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "اماں کے یا عذرا کے پاس کچھ ہو تو کہہ نہیں سکتا۔ بینک میں البتہ بارہ ہزار ہیں مگر ۔۔۔"

"اگر مگر کا اب وقت نہیں رہ گیا۔" رضا نے کہا۔ "میرے پاس بھی تھوڑا بہت کچھ ہے۔ فوراً بلاؤ عذرا بھابی اور شائستہ کو۔ فوراً بازار چلیں۔ بھائی سوچ کیا رہے ہو۔؟"

"کچھ نہیں۔ اب سوچنے کے لئے کیا باقی رہا ہے؟"

"پریشان لگ رہے ہو" رضا نے کہا۔

"بہت۔ آئندہ کا خیال مارے ڈالتا ہے۔" امیر احمد نے کہا۔ "ویسے رشتہ بہت اچھا ہے۔ کہاں ملتا زوبی کو اب اتنا بڑا ایسا گھر مگر بہت

پریشان ہوں۔ زوبی کی سی کندہ ناتراش، زبان دراز اور ناسمجھ لڑکی ایسے لوگوں میں کھپ بھی سکے گی کہیں ایسا نہ ہو کر بعد کو ___"
"اماں ایکدم سے کیسے راضی ہو گئیں"؟ رضا بھی فکر مند ہو گئے
"انتصار صاحب نے انھیں بھی ہموار کر لیا"۔ امیر احمد بولے۔"ایسی ایسی نادلیلیں پیش کیں کہ اب میرے فرشتے بھی وہ باتیں نقل نہیں کر سکتے"۔ بس اماں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے"۔
"زوبی کا رد عمل کیا ہے؟ حیران ہو گی؟"۔
"ابھی اس سے ملا کہاں۔"؟ پھیکا تبسم امیر احمد کے خشک ہونٹوں پر نمودار ہوا۔
"خیر۔ اب بھابی اور شائستہ سے کہو کہ اسے اچھی طرح سمجھائیں نئے گھر میں خود کو سنبھال کر رہے۔ زبان بند رکھے جواب نہ دے اپنے فرائض اچھی لڑکی اچھی بہو بن کر انجام دے"۔
کھانے کے بعد امیر احمد رضا عذرا اور شائستہ خریداری کے لئے چلے گئے۔ تب ڈری سہمی زوبی اپنے کمرے سے نکلی۔ اور غیروں کی طرح اپنی اماں کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اماں کی خوشی ایک بے پایاں غم میں بدل گئی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور سینے سے لگا لیا۔ پھر ان کے آنسو اس کے سر پر برسنے لگے۔ زوبی حیران تھی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنی جلدی وہ دلہن بن جائے گی۔ سرخ و سبز سے جھم جھم کرتے کپڑے۔ اچھے اچھے زیور۔ بڑا سا گھر اور افتخار ___ بس اس کی سوچ کی اڑان یہیں تک تھی۔ اماں کے آنسو اسے متاثر نہ کر سکے۔ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ اس نے سنا بھی نہیں

"زبان چلانا۔ ساس سسر کا ادب کرنا۔ افتخار مجازی خدا ہے۔ ٹرّاپن نہ کرنا۔ سب کی خدمت کرنا۔ خبردار۔ میکے کو بدنام نہ کرنا!" اور جانے کیا کیا۔

اس نے سنا ہی نہیں۔ اس کے سامنے افتخار آکھڑے ہوئے۔ خوبصورت ہنسنے مسکرانے والے۔ انھوں نے کہا تھا کہ "تم بہت خوبصورت ہو۔ ہائے اللہ۔ دلہن بنی کتنی اچھی لگوں گی۔ پھر۔ پھر معلوم نہیں کہ۔ میں یہاں کب آؤں۔" اس کا دل بھر آیا۔

کتنی وسیع و عریض خوابگاہ تھی۔ چھت سے دو تین بڑے بڑے فانوس لٹکے گویا فرش پر جھکے آرہے تھے ان کی ہر بجلی جھالر میں ایک رنگین بلب آویزاں تھا۔ ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے نلکیاں بج اٹھتیں اور ساتھ ہی ان کے بلکوروں سے فرش پر خوشنما سائے بنتے بگڑنے لگتے چھت سے کچھ نیچے رنگ برنگی ہلکی پھلکی جھالریں لگی تھیں۔ دیواروں پر بڑے بڑے شاندار اسنیپ آویزاں تھے فرش پر دبیز قالین۔ اس کی شاندار مسہری۔ نرم گدگدا ریشمی بستر پروں کا تکیہ۔ اور وہ لباس جو اس کے جسم پر تھا۔ کتنا خوبصورت تھا۔ ایسا لباس اس نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے کتنے پیار سے زیور پہن رکھے تھے کلائی بھر بھر کے جھلمل کرتی چوڑیاں۔ ان کے آگے پیچھے سونے کے کڑے گلے میں بھاری گلوبند۔ دور تک پھیلا ہوا چندن ہار۔ کانوں میں

بھاری سے کرن پھول اور پور پور انگوٹھیاں۔ پاؤں میں سونے کی پازیب۔ انگوٹھے اور انگلیوں میں گھنگھرو جڑے چھلے۔

اس نے منزا اسی آنکھیں پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ اور اپنے ہاتھ پر زور سے چٹکی لی۔ پھر زیر لب بڑبڑائی۔

میں مرادماری سوچ رہی تھی کہ خواب دیکھ رہی ہوں" پھر جلدی سے دانتوں تلے زبان دبالی۔ نہیں رب نے سمجھایا تھا کہ بڑی سسرال ہے بڑے لوگ ہیں۔ اب گالی نہ بکنا۔ کوسا کاٹی نہ کرنا۔ تمیز سے رہنا۔ چپ رہنا زبان درازی نہ کرنا۔ نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں کروں گی۔ اللہ میاں آپ مجھے چپکے چپکے سب سکھا دیجئے۔ جو میں نہیں جانتی۔

پھر اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اور کوئی اس کے پاس آ بیٹھا۔ اس نے جلدی سے اپنا زر کار آنچل منہ پر سے سرکایا۔ اور بے ساختہ بولی۔ "ہائے مہمان صاحب۔ آپ!" اور انگلی دانتوں میں دبا کے دہری ہو گئی۔ افتخار رشید خطمی ہو گئے۔ اس بے ساختہ ادا پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ انھوں نے اس سرخ و مرصع گٹھڑی کو اپنی طرف سمیٹ لیا۔ اور کانپتے لبوں سے جانے کیا کہنے لگے۔

"تم میری پہلی اور آخری آرزو ہو۔ تم نے میرے دل کی دنیا درہم برہم کر دی ہے۔ میں تو تمھارے سوا ساری دنیا کو بھول گیا تھا۔ تم نہ ملتیں تو کیا کرتا۔ کہیں بھاگ جاتا۔ خودکشی کر لیتا۔ تم کتنی پیاری لگ رہی ہو میری جنت نگاہ۔ میری زندگی میری روح۔ کیا سوچ رہی ہو۔ کچھ باتیں کرو۔ تم نے کم میری ہمت کی داد ہی دو جان پر کھیل کر کیسے سب کو راضی کیا ہے۔ کہ آخر سبھی کو میری آرزو کے آگے جھکنا پڑا۔ یہ آرزو ہی تو۔

یہ ساز و سامان دیکھا ہے تم نے۔ یہ سب بھائی جان نے اپنے خاص فلاز موں سے کروایا ہے۔ بھاگم بھاگ۔ میں تو بھائی جان کے پاؤں پڑوں گا۔ انہی کی وجہ سے تم ملی ہو۔ ورنہ بھئی۔ دیکھو۔ تم ذرا مطلب یہ ہے کہ۔ جس طرح اپنے گھر میں بے تکلفی سے رہتی بولتی تھیں۔ اس طرح نہ رہنا۔ کچھ عرصے کے لئے۔ اچھا؟ کسی کو بے تکے جواب نہ دینا۔ بھائی جان بھابی سے ادب سے پیش آنا۔ بھائی جان مجھ سے بہت بڑے ہیں۔ امی جان اور ابا جان کی خدمت کرنا۔ خدمت ہی میں تمہاری ہماری عظمت ہے۔ سمجھیں؟"

افتخار دولہا نے تھے تو کیا۔ اس کے لئے نئے آدمی تو نہیں تھے کہ شرماتی۔ سر جھکاتی۔ وہ تو پرانے آدمی تھے۔ اس نے ان کی نصیحت سننے کے بعد زور زور سے سر ہلایا۔ اور جھجکے بغیر بولی۔ "سب نے اسی طرح سمجھایا ہے۔ ہائے اللہ۔ میں کوئی جنا در ہوں کہ یکبار گی سب کو کاٹ کھاؤں گی۔ معلوم ہے مجھے کہ سب کے کام کاج کرنے ہیں۔ بار بار ڈرانے سے کیا فائدہ۔"

"ذوبی۔ خدا کیلئے۔" افتخار گھبرا گئے۔ "دیکھو اس لب و لہجے میں بات نہیں کرتے"

وہ افتخار کی سنہری ذات تھی۔ مگر کندہ ناتراش کو تراشتے سنوارتے گزر گئی پھر بھی وہ بددل اور بیقرار نہیں ہوئی۔ اسکے مسحور کن حسن نے انھیں دیوانہ کر رکھا تھا۔ دلہن بن کر تو وہ زیادہ قاتل ہو رہی تھی۔ جس نے اسے دیکھا تھا۔ حیران رہ گیا تھا۔ افتخار تو شہر سے شہر کا دل لے آئے تھے۔ خوش نصیب تھے۔ ان کی سنگیتر سفینہ اتنی حسین تو یقیناً نہیں تھی۔ شادی کے بعد چند دن تو سکون سے گزرے۔ نئے نویلے جذبوں

کا دبیز نقاب افتخار پر پڑا رہا۔ ابھی تو سرشار تھے۔ اس کے بعد ایک دوسرے کے جوہر کھلنے لگے۔ مگر آہستہ آہستہ ــــ

انتصار احمد سے چھوٹی اور افتخار سے بڑی بہن مہرالنساء بیگم حویلی ہی میں رہتی تھیں۔ انھیں بھی خدا نے حُسن و دولت اور اولاد سے سرفراز کیا تھا۔ زمین پر پائیں رکھنا انھیں ناگوار تھا۔ آسمانوں پر چلتی تھیں کسی سے سیدھے منھ نہ بولنے والی۔ دو پڑھے لکھے لڑکے اور ایک تعلیم یافتہ بیٹی پر نازاں اور مفتخر شوہر ایئرن فیکٹری کے مالک ہے، دولت کی فراوانی نے سارے خاندان کو مغرور و متکبر بنا رکھا تھا۔ کسی کو یہ لوگ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

زوبی کو دیکھ کر مہرالنساء بیگم کے سینے پر اژدہے لوٹ گئے اپنی ستائش و توصیف کی نفی کرنے اور اپنے دل کو سکون بخشنے کی خاطر انھوں نے افتخار کا دل برا کرنا شروع کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے ایک نہ ایک شوشہ چھوڑ دیتی تھیں۔ ان کی بیٹی گرجوئیٹ تھی۔ اس نے زوبی کو تختہ مشق بنا لیا۔ افتخار کے سامنے اس کی برائی کہہ کے ہنستی تھی۔

"اے ماما جی فقط صورت ہی تو گھول کے پی لینے کی چیز نہیں ہوتی۔ آپ نے مامی جی کی سیرت نہیں دیکھی۔ میں تو شرم کے مارے گڑ گئی کل وہ حویلی کی نوکرانی رمضان کی اماں سے اپنے گھر کا دال کہہ رہی تھیں۔ اور وہ دو ٹکے کی عورت مسکرا رہی تھی۔ اس طرح ہماری عزت اور شان خاک میں ملے گی کہ نہیں۔ یہ عورت مامی کی باتیں باہر جا کے کرے گی۔ آپ کو گوارہ ہے یہ ذلت۔

"ابھی چند دنوں بعد وہ اس گھر کے رہن سہن سے واقف ہو جائے گی۔" افتخار ٹال لیتے۔ اور اکیلے میں زوبی کو سمجھاتے۔

"اب تم بھی بڑے لوگوں میں شمار کی جاتی ہو زوبی۔ اپنے گھر کی سی باتیں یہاں نہ کیا کرو۔ تم اپنا طرز بدلو۔ ہم سب کے انداز دیکھ کر کوشش کرو کہ معتبر طریقے پر رہنا سیکھو۔ گھر کے ملازموں یا نوکرانیوں سے بے تکلفی سے باتیں کرنے میں بڑی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ لوگ گھر کی باتیں باہر جا کر کرتے ہیں۔ اور مالکوں کو نظروں سے گرا دیتے ہیں۔ بھابی جان کی طرح تم بھی اس حویلی کی بہو ہو۔ شان و شوکت دبدبے اور لئے دئے انداز میں رہا کرو۔"

"رہا کروں گی۔" زوبی نے خفا ہو کر منہ پھلا لیا۔ "مگر میں نوکروں سے باتیں نہ کروں تو کیا کروں۔ آپ کا کوئی رنگا سگا میرے پاس آتا ہی نہیں ہے۔ اکیلی کیا دیواروں سے سر پھوڑوں۔ آپ کو بھی آپ کے بھائی باپ نے زمینوں پر گھسیٹ لیا ہے۔ آگ لگ جائے زمینوں کو میں تو گونگی بن کے رہ گئی ہوں۔ کل وہ آپ کی نخرے خور بھابی تمہیں مجھے دیکھ کے بھنّیں چمکا رہی تھی۔ میرے سر پر اسے سینگ دکھائی دئیے تھے۔ آپ سب نے اور اماں نے جواب دینے اور لڑنے سے منع نہ کیا ہوتا تو ننو کے وہ بخیئے ادھیڑتی کہ یاد کرتیں کسی سے واسطہ پڑا تھا۔"

"زوبی خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔ کیا تم خود کو اور مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو۔"

"آپ نے لوگوں کو بھی منع کر دیجئے کہ میرے منہ نہ آئیں۔" زوبی

نے للکار کر کہا۔

"کیا ایسے لوگ اپنے لوگ کہہ رہی ہو۔" افتخار جھنجھلا گئے "اب یہ سب تمہارے لوگ بھی ہیں۔ سمجھیں؟" مگر درحقیقت وہ لوگ افتخار کے لوگ تھے۔ کبھی زوبی کے نہ ہو سکے۔ ایک تو انتصار احمد کا نرالا انصاف انھیں پسند نہ تھا۔ دوسرے نعمان بہادر صاحب اور بیگم صاحبہ کو سفینہ کے والدین سے جواب دہی کی ندامت اٹھانا پڑی تھی۔ اس ذلت اور شرمساری کا انھیں سخت احساس تھا۔ آج تک کسی کے سامنے ان کی آنکھ اور ناک نیچی نہ ہوئی تھی۔ نہ کہ انھیں افتخار کی بیہودگی کی وجہ سے دونوں سے معافی مانگنی پڑی تھی۔ اس ندامت کا غصہ بھی زوبی ہی پر اترا تھا۔ کہ در پردہ وہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ اور منتظر تھے کہ کب افتخار زوبی سے بددل اور بیزار ہوتے ہیں۔

انتصار احمد کی بیگم سلمانہ صاحبہ نے تو جاہل گنوار دیہاتی سے تو بات تک کرنا پسند نہیں کی۔ بلکہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی منع کر دیا کہ چچی کے پاس جا کے نہ کھیلا کریں۔ انتصار احمد نے تو مڑ کر بھائی بھاوج کی خبر بھی نہ لی۔ ہمیشہ باہر رہتے۔ جاگیر کا انتظام زمینوں کی دیکھ بھال۔ شکار کا شغل۔ وہ بہت مصروف آدمی تھے۔ کبھی کبھی حویلی میں آتے اور فوراً چلے بھی جاتے۔

افتخار کو بھی تعلیم وغیرہ کو خیرباد کہہ کے بھائی کا ہاتھ بٹانا پڑا تھا۔ وہ بھی دن بھر حویلی میں نظر نہ آتے۔ بس ایک مہیب سی تنہائی تھی۔ جو زوبی کو کھائے لیتی تھی۔ کہاں وہ اس کی شرارتیں اچھل پھاند

زبان کا استعمال، اور کہاں یہ ماحول، جیسے وہ زندہ مردہ تھی۔ اور بڑی اونچی سی قبر میں دفن کر دی گئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اوسان کھونا شروع کر دیئے۔ اپنے کمرے سے باہر نکلنے لگی لیکن بیکار، خان بہادر صاحب کی بیگم اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں۔ سلمانہ بیگم بے حد خاموش طبع اور غائیت درجہ محتاط تھیں۔ انھوں نے ایک بار بھی زدنی سے بات نہ کی تھی۔ اور مہر النساء ان کی لڑکی ثمر۔ آپس میں کچھ کہہ کے ہنسنے لگتی تھیں۔ زدبی سر سے پاؤں تک تماشہ بن جاتی۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے منہ نوچ لے لیکن پھر ان کی یہ نصیحت کام آجاتی۔ اور وہ لبوں پر خاموشی کی مہر لگا لیتی لیکن اندر اندر گھٹتے جلتے کڑھتے وہ بیمار سی رہنے لگی۔ نہ کسی سے بات چیت۔ نہ کہیں آنا جانا۔ نہ کوئی دلچسپی۔ اس کے بس میں صرف گریہ وزاری تھی۔

اس نے ایبار رنگ روپ کھونا شروع کر دیا۔

ایک دن افتخار نے سب سے گلہ کیا تھا۔ آپ لوگوں نے مجھے اور زدنی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے۔ کون سی خطا میں نے ایسی کی ہے جس کی سزا یہ خاموشی ہے۔ زدبی کا قصور کیا ہے۔ اسے آپ لوگ صرف میری بیوی کیوں سمجھتے ہیں۔ کیا وہ آپ کی کوئی نہیں۔ امی جان، بھابی، باجی اور ثمر سب اس سے کٹے کٹے رہتے ہیں۔ اسے دیکھ کر ہنستے ہیں۔ اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں آخر کیوں۔ کیا صرف اس لئے کہ آپ لوگوں نے دو چار کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ اور وہ ان پڑھ ہے۔ اس کے سوا کیا خطا ہے اس کی! ان پڑھ

ہونا کوئی گناہ نہیں۔ کوئی جرم نہیں۔ مجھے بھی معلوم تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔ مگر میں نے اسے اپنا شریک زندگی چن لیا۔ کیا آپ لوگ میری خاطر اس رشتے کا احترام بھی نہیں کر سکتے۔ کہ میرے تعلق سے وہ آپ سب کی بھی کچھ ہوتی ہے۔ میں کہے دیتا ہوں یہ صورت حال میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ یا تو اسے بھی اپنی ربط کی طرف لایئے یا پھر مجھے بھی اجازت دیجئے۔ الگ گھر بسا دوں ایک طرف آپ لوگوں کا مخاصمانہ سلوک۔ دوسری طرف اس کا گلہ شکوہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میری صحت متاثر ہو جائے گی۔ بس اگر دیجئے ایک فیصلہ اس ضیق النفس سے نجات ملے۔ مجھے بھی۔ آپ سب کو بھی۔"

"ماماجی! ان سے کیا باتیں کریں۔؟" شہر بولی۔ "ہمیں گھر پلو باتیں آتی نہیں۔ ادر ادبی گفتگو وہ سمجھ نہیں سکتیں۔ آپ ہی بتائیے"۔

"گھر کے کام لیجئے اس سے"۔ افتخار نے اپنی بھابی اور باجی سے کہا۔ "کیا آپ لوگ باورچی خانے کا انتظام نہیں دیکھتیں۔ اسے بھی ساتھ میں رکھا کیجئے۔ اب تو وہ میری بیوی ہے۔ آپ لوگ اس سے لاکھ گریزاں رہیں۔ مگر نہ وہ اس گھر سے جائے گی۔ نہ یہ رشتہ ٹوٹے گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے" نہایت سنجیدگی سے بھابی نے کہا "ہم انھیں کام کاج میں لگا دیں گے"۔

"مگر کہیں خادمہ ہی بنا کے نہ رکھ دیجئے گا"۔ افتخار نے کہا۔

"توبہ کرو صاحبزادے"۔ باجی نے اشتہزائیہ انداز کی سنجیدگی سے کہا۔ "میری چھوٹی خوبصورت بھاوج بھلا کہیں خادمہ بھی بن سکتی ہے۔ وہ تو راج کرے گی۔ اس گھر پر ہم سب پر"۔

"باجی۔ آپ کے یہ زہریلے طعنے مجھے پسند نہیں"۔ افتخار نے کہا۔
"نہ تمہیں نہ ادھر چین نہ ادھر قرار"۔ بیگم صاحبہ نے موٹی آواز میں کہا۔ "گھر کا کام کاج کرتے کوئی خادمہ کہاں ہو جاتا ہے۔ میں بھی تمہارے باپ کے لئے ایک ڈش ضرور پکاتی ہوں۔ گھنٹوں چولھے میں منھ دیئے رہتی ہوں۔ کیا میں بھی خادمہ ہو گئی ہوں"۔
"میرا انداز گفتگو ہی ایسا ہے"۔ مہر النساء نے کہا۔ "تمہیں پسند نہ ہو تو میں تمہاری بیوی سے باتیں ہی نہ کروں"۔
"آپ سب کو بھی نہ ادھر چین نہ ادھر قرار"۔ افتخار غصے سے بولے۔ "طے کر لیا ہے آپ سب نے کہ صلاحیت اور شرافت سے کسی معاملہ میں غور نہ کیجئے گا۔ اچھی بات ہے۔ میں بس چند ہی روز اور دیکھوں گا۔ پھر ــــــ" اور اس چیلنج آمیز "پھر" کے بعد وہ اٹھ کر چلے گئے۔
"کیا ایسی جان لڑکا آپ کے ہاتھ سے"۔ مہر النساء نے کہا۔
"وہ تو تمہاری شرافت کو للکار گئے"۔ سلمانہ بیگم نے آگ کو ہوا دی۔ "مطلب یہ کہ تم شریف نہیں ہو۔ اک وہ ہے شریف جو غیر مرد سے دیدہ لڑا کے اس کا ہاتھ پکڑ کر چلی آئی ہے"۔
"کے دن کی ہے ہوئی"۔ بیگم صاحبہ نے تنفر آمیز پیرایہ میں کہا۔
"صبر کرو۔ افتخار اس کی جہالت سے خود ہی بیزار ہو جائے گا۔ میں کہتی ہوں کہ کیسی گنوار لڑکی ہے۔ کل میں نے دیکھا کہ بولائی بولائی سی اپنے کمرے سے نکلی۔ اور کپڑا بھگو کر گھر بھر کے دروازے کھڑکیاں، الماریاں، میز کرسیاں صاف کرنے لگی۔ پھر باورچی خانے میں جا کر گیس کے چولہے اور بڑے چولھے چمکا دئے۔ یہی انداز ہ

کے سے کام اسے اچھے بھی لگتے ہیں۔ کبھی کوئی کتاب لے کے پڑھتے
نہیں دیکھا۔۔۔ خدا غارت کرے۔ اسے میرے پڑھے لکھے بچے
کی قسمت میں یہی کمینہ لکھا تھا۔"

"امی! کتنے دنوں سے خانساماں چھٹی مانگ رہا ہے۔" مہرالنساء
نے سرگوشی کی۔ "آپ اسے چھٹی دے دیجئے۔ ادھر ممانی اشرفی بیمار
پڑی ہیں بس۔ کچن حوالے کر دیجئے۔ اپنی بہو بیگم کے۔ چار ہی دن
میں بے اوسان ہو کے میکے بھاگ جائیں گی۔"

"کیا کہے گا افتخار؟" سلطانہ بیگم بولیں۔

"اس کے کہنے کا ڈر کسے ہے۔" بیگم صاحبہ نے۔ "وہ تو کہہ ہی
گیا ہے کہ کام کاج کیا کیجئے۔"

اور یہی ہوا۔ دوسرے دن بیگم صاحبہ نے اسے الٹی میٹم
دے دیا۔ اب کچن وہ سنبھالے۔ ان کا خیال تھا کہ زدی ناک
منہ چڑھائے گی مگر وہ تو کھل اٹھی۔ سر اٹھا کے بولی۔

"اچھا۔ امی جان۔ اب میں ہی پکایا کروں گی۔ خوامخواہ کا باورچی
کا خرچہ کیا۔؟ بتلا دیجئے مجھے کیا پکاؤں۔"

نیلی زرکار ساری، نیلے بلاؤز اور ہلکے پھلکے زیوروں میں کتنی
پیاری لگ رہی تھی۔ بیگم صاحبہ کے دل میں ستائشی جذبہ ابھرا
اور دب بھی گیا۔ سفینہ کی امی نے انھیں کتنا برا بھلا کہا تھا۔ ساری
عمر کی دشمنی باندھ لی تھی۔ انھوں نے روکھے پن سے کہا۔ "جو تمہارا
جی چاہے۔" زدی کچن میں آئی۔ ایک بار پھر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یہ
تو ایک ہال تھا۔ شیشے کی طرح جھلملاتا ہوا۔ خوبصورت صاف ستھرا

دیوار گیر الماریوں میں کراکری چمک رہی تھی بڑی میز پر ہر طرح کی سبزی رکھی تھی۔ الماریوں میں اسٹیل کے ڈبوں میں مصالحے، دالیں اور جانے کیا کیا ۔۔۔ میز کے نیچے ڈبوں میں دال چاول گیہوں ۔ الم غلم ۔۔۔ زوبی نے کمر کس لی اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب اپنی بحالت کا مداوا خدمت ہی سے کرے گی۔ کبھی تو پتھروں سے پسینہ بہہ نکلے گا۔

اس روز شام اتفاق سے انتصار احمد اور خان بہادر صاحب بھی گھر پر تھے۔ اور بیجان بوجھ کر مہر النساء بھی مع لڑکوں اور تمر کے یہیں آ گئی تھیں۔ جب بھی آتیں کھانا کھائے بغیر نہ جاتیں۔ وہ اور سلطانہ بیگم سرگوشیوں میں مصروف تھیں مسکرا رہی تھیں۔ کھانے پر جو حشر زوبی کا ہونا تھا۔ اس کا تصور انہیں ابھی سے مسرور کر رہا تھا۔ کھانا کریہہ پکا ہوگا۔ الا بھیکا تحقیر سے رکھ دیا ہوگا۔ لیکن کھانے کی میز پر آئے تو خیال بدلنا پڑا۔ زوبی کو اماں نے کھانا پکانے کے سلسلے میں طاق کر دیا تھا۔ اب اس نے اپنی مرضی سے قیمہ پلاؤ، بڑے بڑوں کا مسالحہ دار سالن، چکن روسٹ اور آلو چاپ بنائے تھے۔ ملائی مالجو دانے کا فروٹ کسٹرڈ تھا۔ خان بہادر صاحب اور انتصار احمد نے بھی باورچی کی تعریف شروع کر دی۔ زوبی ایک طرف الگ گوشے میں کرسی پر بیٹھی گود میں رکابی رکھے کھا رہی تھی۔ میز کرسی پر کبھی وہ بیٹھی نہ تھی اس کا کہہ بیٹے، باورچی کو جا رہا تھا۔ وہ بزرگ مردوں کا خیال کئے بغیر بلند آواز میں بول پڑی۔

باورچی کو تو امی جان نے چھٹی دے دی ہے۔ بڑے بھیا یہ تو میں نے پکایا

ہے۔ پوچھیے افتخار صاحب سے اپنے گھر میں بھی میں ہی پکایا کرتی تھی ایک دفعہ تو انھوں نے کہا تھا کہ "جی چاہتا ہے کہ پکانے والی کی انگلیاں کاٹ کے کھا جاؤں"۔ پھر وہ بڑی مسرور سی مترنم ہنسی ہنس دی۔

خان بہادر صاحب جلدی جلدی نوالہ بنانے لگے۔ انتصار صاحب کھانستے تھے اور افتخار کا چہرہ شرمندگی کے مارے سُرخ ہو گیا۔ انھوں نے حاضرین کے چہروں پر تمسخرانہ مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔ جاہل بے ادب۔ جسے بات کرنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ نہ بڑوں کا ادب نہ برابر والوں کا لحاظ پہلی بار افتخار اس پر برس پڑے تھے۔

"سمجھدار لڑکیاں سسرال جا کے وہاں کے ماحول اور رشتے عزیزوں کو چند ہی روز میں پرکھ لیتی ہیں۔ ان کے مزاجوں کے مطابق ڈھل جاتی ہیں۔ مگر ایک تم ہو جوں کی توں لٹھ رکھی ہو۔ سمجھاتے سمجھاتے میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ کیا اب مجھے یہی کہنا پڑے گا کہ بے پڑھی لکھی جاہل ہو تم۔ آج تو تم نے بے جا شرمندہ کیا۔ میاں بیوی میں ہزار طرح کی باتیں ہوتی ہیں وہ کیا سب کے سامنے بک دینے کی ہوتی ہیں۔ اب کیا صورت دکھاؤں گا سب کو دیکھا نہیں تمھیں کس طرح مسکرا رہے تھے"۔

اور زولی کا ضبط رخصت ہو گیا۔ ساری نصیحت فضیحت بھول کر بولی "ہاں وہ بد تمیز تو ہر وقت تمھی سے چمکایا کرتی ہے۔ میں بہت برداشت کر رہی ہوں جی۔ پر اب نہیں کرنے کی تعلیم یافتہ ہو گی تو اپنی جگہ۔ پھر بھی میری کسی بات پر ہنسے گی تو دانت حلق میں اتار دوں گی وہ باتیں سناؤں گی کہ نانی یاد آئے گی۔ تو صاحب ایک تو کھڑے کھڑے اتنا مارا اناجہ کا سوپ کے رکھا۔ وہ تو کچھ نہیں۔ پانچوں بار

دکھ دکھ گئے۔ اوپر سے لال تان منہ سی مذاق۔ مجھے اماں کے ہاں بھجوا دو۔ میں نہیں رہتی یہاں۔"

"پھر وہی بد دماغی کی باتیں! کیا سمجھایا تھا میں نے۔" افتخار بگڑے۔

"نہیں آتیں سر پھری باتیں میری سمجھ میں۔ دیکھتے تو تھے کہ میں کیسی تھی۔ پھر کیوں بیاہ کے لائے میری مٹی خراب کی۔ ہائے اماں آپ کہاں ہیں۔ آ کے مجھے لے جایئے۔"

"خبردار۔ رونا نہیں۔" افتخار نے جھڑکی دی۔ "میں ان نخروں میں آنے والا نہیں ہوں۔ سمجھیں!"

مگر زوبی کی بے اختیار گریہ وزاری بند نہیں ہوئی۔ تب افتخار غصے سے پاؤں پٹختے باہر نکل آئے۔ بیگم صاحبہ اپنی بہو بیٹی کے پاس بیٹھی کچھ سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ افتخار کو دیکھ کر سب چپ ہو گئے۔

"کہاں جا رہے ہو۔ پاس تو آؤ۔" باجی نے کہا۔

وہ چلے بیٹھنے سے آ بیٹھے۔ بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ تمہاری دلہن کے رونے کی آواز آ رہی تھی کچھ کہہ دیا اس سے۔"

"اب بیاہ لائے ہو تو نباہو۔ یہ کیا نئی دلہن کا رونا دھونا۔" بھابی نے کہا۔

"نباہنا کیسا بھابی! وہ لڑکی اس ماحول میں کھپ ہی نہیں سکتی!" باجی نے حاشیہ چڑھایا۔ "وہ تو عجیب مزاج کی ہے۔ ابھی پرسوں دوپہر کو باجی کی کوٹھری میں بیٹھی ان سے گھر کی باتیں کر رہی تھی۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے سنا۔ پھر مکر اس بھی۔ خاک پلے نہ پڑی۔ اے افتخار کیا تم سے بھی اسی طرح کی باتیں کرتی ہے؟"

"سمجھانے بجھانے سے سرکس کے جانور تک سیکھ جاتے ہیں۔ یہ
انسان کیسا عجیب جانور ہے۔ کہ لاکھ سکھاؤ پڑھاؤ بگڑ دیتی۔۔۔
نیچرتس کا مینٹنس؟" بھابی نے کہا۔ "بھئی وہ تمھاری بیوی ہے تم اس
کی ہر ادا میں حسن دیکھتے ہو۔ مگر میں نہیں سمجھتی کہ بدتمیزی، پھوہڑپن اور
گستاخی میں بھی کوئی حسن ہوتا ہے۔ وہ تو یہاں حویلی کی آن بان اور
بزرگوں کی عزت پر پانی پھیرنے آئی ہے۔"

"کیا کروں؟" افتخار جھنجھلا کر بولے۔ "طلاق دے دوں، چھوڑ دوں
ماروں پیٹوں۔ آخر میں کروں تو کیا۔ ادھر آپ سب مجھے دھانستے
ہیں۔ ادھر وہ میرا دماغ خراب کرتی ہے۔ کیا میں پاگل نہ ہو جاؤں گا"

"چھوڑو، پہلی فرصت میں طلاق دے دو اسے!" بیگم صاحبہ کا غیظ و
غضب کم ہوتا ہی نہ تھا۔ "میں سفینہ کو بیاہ لاؤں پڑھی لکھی سلیقہ
مند۔ تمیزدار اور جانی بوجھی لڑکی کو چھوڑ کر تم ایک خوبصورت جانور
خرید لائے ہو۔ ہم سب بیزار ہیں اس سے کسی کام کی نہیں۔ تمیز چھو
نہیں گئی کہ حد سے زیادہ زبان دراز ہے۔ ارے نجانے کیا دیکھ کر
شہریار مسکرا رہا تھا۔ بس لے دوڑی اس کی مسکراہٹ کو۔ کہنے لگی یہ اتنی بڑی
بیٹی کو دیکھ کر ہنس رہے ہو۔ اماں بہنوں کے ساتھ ہنسو شہریار بیچارہ ہکا بکا
رہ گیا۔ مجھ سے آکے کہنے لگا کہ نانی حضور میں تو مالی کے بچوں کو کشتی
لڑتے دیکھ کر ہنسنے لگا تھا۔ بھلا میں کیا ان کا احترام نہیں کرتا۔"

"سچ کہتا ہوں۔ پاگل ہو جاؤں گا۔" افتخار نے اپنے دانت پیس کر اپنا
سر پکڑ لیا۔ "یا خدا مجھے عقل نہ آئی کیسا عذاب سمیٹ لایا ہوں۔ اب
کیا ہوگا؟"

"میں دیئے دیتی ہوں اس کا مہر اکیس ہزار۔" بیگم صاحبہ تو خوش ہونے لگیں۔ "اللہ نے مجھے اس کا حق دیا ہے۔ کہ گھر کی دہلیز ابھی نہ چھوڑو تو اکھاڑ پھینکوں۔ افتخار ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ پھر اللہ نہ کرے کہ بچے دیچے کا جھنجھٹ شروع ہو گیا تو پچھتاؤ گے۔"

"عمر بھر کا روگ اچھا نہیں افتخار۔" باجی نے کہا۔ "تم باور کرو کہ اس کے ساتھ خوش نہ رہ سکو گے۔ اپنی جہالت اور زبان درازی سے کیا انھیں تکلیف نہیں ہو جاتی۔ کل کو زبان کھلے گی تو ہم سب کے ساتھ بھی بیہودگی کرنے لگے گی۔ ابّا جان دل کے اور امّی جان بلڈ پریشر کی بیمار ہیں، کوئی دکھ انھیں لے بیٹھا تو پھر ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ یاد ہ ماں باپ سے زیادہ تمھیں عزیز ہے۔"

"ابھی کچھ دن اور دیکھئے امّی جان۔" افتخار نے بدحواس ہو کر جواب دیا۔ "اتنی جلدی بھلا اتنا بڑا کام کیسے کر سکتا ہوں۔ کیا کہیں گے رضا رامپیر۔ آپ امی جان اور ابا جان کی زندگی کی خیر چاہتی ہیں۔ یہی صورت حال ادھر بھی درپیش ہے۔ زد بی کی امی ڈپیر شین کی مریض ہیں۔ زد بی کی طلاق ان کی موت بن جائے گی۔ ان کا خون میری گردن پر ہوگا۔ مزید برآں میں سب میں بدنام ہو جاؤں گا۔ سب سے لڑ جھگڑ کر بڑے زعم سے لایا ہوں اسے۔"

پھر یہ گمبھیر مقدمہ انتصار احمد کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے فیصلہ سنا دیا کہ افتخار اپنا حصہ لے کے الگ ہو جائیں۔ کیونکہ بیوی کی جہالت ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ انھوں نے شیخ میراں سے ابا جان کی نسبت فرمایا تھا کہ بڑے صاحب کا نام ڈبو رہے ہیں یہ بچہ۔ شیخ میراں منھ پیٹ رہے تھے کہ سرکار کی نسبت یہ گستاخانہ

زن بھی تو سید ہے منہہ نہ بولیں ۔ میں تو ــــــ !"

"تمہاری جہالت حد سے بڑھ چکی ہے زوبی" افتخار نے برہم ہو کر کہا۔ "تم کسی سے تمیز سے بات نہیں کر سکتیں ۔ میں پوچھتا ہوں تم نے اباجان کو ملازم کے سامنے بڈھا کیوں کہا ؟"

"بڈھے کو بڈھا نہ کہتی تو کیا جوان کہتی ۔" زوبی نے کہا۔

"شہریار سے کہیو کہ اگر مجھے دیکھ کے ہنسو گے تو دانت حلق میں اتار دوں گی !" افتخار مارے غصّہ کے کانپ رہے تھے۔ "کیا سوچے گا وہ۔ ایک ممانی اس کی اتنی تعلیم یافتہ ــــــ دوسری اتنی جاہل گنوار !"

"دیدہ اپنے کتّے نے نہیں کاٹا کہ شہریار کو جھنجھوڑ نہ کھاتی !" اسی نے تو کی ہی سیکھی تھی ۔ "کالج میں پڑھتا ہے نا ــــــ ! جھوکر بڑوں کو دیکھ کر ہنسنا سیکھ گیا ہے۔ میں تو ایک گھونسہ دیتی منہہ پر مگر آپ کی بہن کا لڑکا ہے۔ اسی لئے لحاظ کر گئی !"

"زبیدہ ۔ تم اپنے حق میں کانٹے بو رہی ہو۔ غصّہ کے مارے مٹھی بند کر کے اور نتھنا پھلا کے افتخار نے کہا۔ "میرا کچھ نہ بگڑے گا تم کہیں کی نہ رہو گی۔ اب بھی سویرا ہے۔ اپنا مزاج کچھ بدلو۔ زبان قابو میں رکھو۔ بزرگوں کا ادب احترام چھوٹوں کا لحاظ اور برابر والوں سے خلوص برتنا سیکھو۔ یہاں کوئی تم سے خوش نہیں ۔ اس طرح زندگی کیسے گزرے گی ۔ کیا تم اپنی بربادی چاہتی ہو۔ بے چاری تمہاری والدہ نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ تم ہر وقت آپے سے باہر رہتی ہو ۔ مگر میں اتنا بھی نہیں سمجھا تھا۔ بتاؤ اب کیا ارادہ ہے

تمہارا ۔۔۔؟"

"یہاں میں بھی کسی سے خوش نہیں"۔ منہ پھیر کر زبیدہ بولی۔
"بہت اچھا۔ تو کر دیا تم نے فیصلہ۔" افتخار نے کہا۔ حیران تھے کیسی حکمی مخلوق تھی کسی بات کا اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ گہری فکر میں کھو گئے۔ ایک طرف ماں باپ۔ بھائی بہن پورا کنبہ دوسری طرف بیوی کسی کی طرف سے بھی بول نہیں سکتے۔ ایک کو راضی کریں تو دوسرا ناراض۔ ماں باپ سارا خاندان یکسر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ مگر بیوی کو تو زبان کی ایک جنبش سے چھوڑا جا سکتا ہے۔
ان کے سبے جاگیردار۔ دولتمند، تعلیم یافتہ اور خوبرو نوجوان کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی کی کیا کمی۔ لیکن زبیدہ کا بھی کنبہ تھا۔ بھائی بہن۔ رضا کی گہری دوستی۔ اماں کی بیماری کا خیال ان کا دماغ گھومنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یہ تو انھیں تجربہ علم تھا کہ ان کے گھر کا کوئی فرد زبیدہ سے راضی اور خوش نہ تھا اور زبیدہ بھی کسی کو پسند نہ کرتی تھی۔

"تو پھر کیا ہوگا ان کا اور اس کا۔ وہ کراہ اٹھے۔

زبیدہ نے ان کی بھی پروا نہ کی۔ انھیں تو شوہر سمجھتی ہی نہ تھی۔ اطمینان سے برآمدے میں جا کے بیٹھ گئی۔ اور ساتھ میں ٹھنڈے ہوئے چلغوزے لیتی گئی۔ اطمینان سے کھانے لگی۔ پوچھا تک نہیں کہ افتخار بیماروں کی طرح کیوں لیٹے رہے۔

دوسرے دن امیر احمد کا خط ملا لکھا تھا کہ ان کے کاغذات مکمل ہو کے آچکے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری

کے لئے امریکہ چلے جائیں۔ اور ادھر چند روز سے اماں کی طبیعت بھی خراب تھی۔ رضا کے ہاں دو دعوتیں ہیں۔ لہٰذا افتخار اور زبیدہ ہفتہ بھر کے لئے آسکیں تو خوشی ہوگی۔

زبیدہ خط کا مضمون سن کر جل گئی۔ افتخار تو اس سے برگشتہ ہو ہی رہے تھے۔ اسے حیدر آباد پہونچا گئے۔ اور امیر احمد سے یہ کہہ کر کہ وہ ان کی روانگی کے وقت آجائیں گے۔ واپس چلے گئے ان کا سلوک اب کی بہت خشک تھا۔ امیر احمد کو ایک اندیشہ ستانے لگا۔

وہ اپنے بڑے وسیع و عریض گھر میں اتنی خوش نہ تھی جتنی کہ ماں کے چھوٹے سے گھر میں آکر خوش ہوتی تھی۔ ویسے چند روز کے لئے افتخار نے اسے بے پناہ محبت دی تھی۔ کبھی۔۔ کبھی تو اسے محسوس ہوتا کہ یہ بناوٹ تھی۔ تصنع تھا۔ دھوکا تھا۔ انسان اتنا پیار نہیں کرسکتا۔ پھر خوشیاں شب و روز کے اڑن کھٹولے پر سوار کہیں اڑ گئیں۔ پیار بھرے وہ لمحے جو گرفت میں نہیں آئے گنے نہیں جاسکتے۔ بس وہ کہیں کھو جاتے ہیں۔ اس کے لئے تھوڑے سے ملتے ہیں۔

اس کی آنکھیں تب بھی نہ کھلیں جب افتخار کی محبت میں بیزاری کی ٹھنڈک ملی۔ اتنی بے حس تھی کہ چونک بھی نہ سکی۔ اس

نے دھوکے کو بھی نہ پہچانا۔

لیکن نہیں ماں باپ بھائی بہن کے سکھانے پڑھانے پر افتخار بدل رہے تھے۔ اب نہ وہ گرمجوشی تھی نہ التفات، اکھڑے اکھڑے سے چہرے پر بیزاری مسلط تیوریوں پر بل۔ ہونٹ بھینچے ہوئے وہ عجیب سے لگتے تھے۔ ایک دوسرا آدمی۔

اب وہ اس پر بگڑ بھی اٹھتے۔ "تم لٹھ ہو۔ لٹھ، کندہ ناتراش میں تمھاری جاہلانہ بکواس سے تنگ آچکا ہوں۔ اب میں پچھتا رہا ہوں۔ میری آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھ گئی تھی۔ مجھے تمھاری صورت ہی نظر آئی۔ سیرت تک میری نگاہیں نہ پہونچ سکیں۔ میں نے بڑی حماقت کی ہے۔

اور اس کے بے تکے جواب پر انھوں نے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"میں اپنے گھر میں دیکھتا ہوں دوستوں کی بیویوں بہنوں سے ملتا ہوں۔ سب ذہین مہذب تعلیم یافتہ اور خوش مزاج ہوتی ہیں۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ مگر تم اس قابل ہی کہاں ہو۔ تم جاہل ہو۔ نہ تمھیں تہذیب ہے نہ تم خوش مزاج ہو۔ پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ بھی تم میں نہیں ہے۔"

اب سب کچھ زبیدہ کو یاد آرہا تھا سب کچھ۔ افتخار اسے گھر پہونچانے کے بعد پھر نہیں آئے۔ امیر احمد کے خط کا جواب بھی نہ دیا۔ رضا کو سارے واقعات معلوم ہوئے تھے۔ وہ بھی فکرمند تھے۔ گمبھیر لہجے میں بولے۔ "سچ ہی کہا تھا خالہ اماں نے بچپن سے

افتخار ضدی تھے۔ جس کھلونے کے لئے مچل گئے۔ لے ہی کے دم لیا۔
بیچارہ سوچا ہے خود ہی توڑ پھوڑ کے پھینک دیں!

"پھر اب کیا ہوگا۔" امیر احمد کا خون خشک ہو رہا تھا۔

"تمہارے خط کا جواب نہیں دیا۔"

"نہیں!"

"زبیدہ کیا کہتی ہے۔"

"کیا کہے گی۔ رو رہی تھی۔ کہ وہاں اسے جاہل کا خطاب ملا تھا
سب اس پر ہنستے تھے۔ اس کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ اس کی
جہالت کا تماشہ بنا رکھا تھا۔ افتخار کو معلوم تھا کہ وہ ان پڑھ ہے
پھر اس کی مٹی خراب کی۔ اب کیا کروں میں۔ کیا ہوگا۔؟"

"ایک بار اور موقعہ دو۔ شاید۔" رضا بولے۔

"زبی کہتی ہے۔ اب نہیں جائے گی وہاں۔ الگ گھر میں
رکھنا منظور کریں تو غالباً۔"

"افتخار ماں باپ کو چھوڑ کر الگ نہیں رہ سکتے۔ میں جانتا ہوں۔
رضا نے کہا۔ "میری عقل پر کیوں پتھر پڑ گئے تھے۔" امیر احمد نے
کہا۔ "ایک لاابالی سطحی آدمی کی ہنگامی خواہش پر میں نے اپنی
بہن کیوں بھینٹ چڑھا دی۔ کاش!! انکار کر دیا ہوتا۔ اماں کتنی
بیمار ہیں۔ دیکھا ہے تم نے؟ کاش تم ہی نے مجھے مشورہ دیا ہوتا۔
رضا تم تو ان کے گھرانے سے بہت واقف تھے۔"

"کوئی بات بگڑنے والی ہو تو اسی طرح عقل اندھی اور ہوش
گم ہو جاتے ہیں۔" رضا بھی بہت پریشان تھے۔ "اچھا زبی کو بلاؤ۔"

ذرا میں پوچھوں۔"

وہ آئی تو سراسیمہ سی سہمی ہوئی۔ رنگ روپ پھیکا۔ چہرہ اداس عجیب سی بدحالی تھی۔ رضا کے استفسار پر رونے لگی۔

"مجھے زہر دیدیجئے کنوئیں میں جھونک دیجئے۔ مگر وہاں نہ بھیجئے سب لوگ مجھ پر ہنستے تھے۔ میرا تماشہ بناتے تھے۔ میں کمرے سے نکلتی نہیں تھی شرم کے مارے۔ آپ کے دوست تو اماں بہن سے کچھ نہیں بولتے تھے۔ مجھی کو کہتے تھے۔ جاہل۔ جاہل۔ جاہل۔ کہاں دفن کر دیتی میں اپنی جہالت۔ کیسے تعلیم یافتہ ہو جاتی یہ ٹھپہ جہالت کا کیوں لگا ہے مجھ پر۔ جاہل کیوں آپ لوگوں نے مجھے نہیں پڑھایا مار کے پڑھاتے معلوم نہ تھا کہ ایک دوسرے گھر میں منہ جھلسنا پڑے گا۔" اور یہ کہہ کر وہ دھاروں دھار روئی۔

"ہم افتخار کو سمجھا دیں گے زوبی۔" رضا نے کہا۔ "اب کی ایسا نہیں ہوگا۔ تم گھر چلی جاؤ۔ سسرال سے بگاڑ کرنا اچھا نہیں تمھیں وہیں تو رہنا ہے نا۔"

اماں کی طبیعت بہت خراب تھی۔ زوبی کی تباہی کا بہت ہولناک مستقبل ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا کیا حشر ہوگا اُس کا اگر افتخار نے اسے رکھنا منظور نہ کیا۔ ان کی بیماری نے سب کے اوسان چھکے چھڑا رکھے تھے۔

ان دنوں رضا کے ہاں دعوتیں تھیں۔ ایک تو ان کے والدین بیت اللہ شریف جا رہے تھے دوسرے ان کے نئے گھر کا افتتاح تھا۔ روز ہی ان کے ہاں مہمان آیا کرتے۔ رضا مصروف رہتے لیکن

انھوں نے ایک خط افتخار کو پھر لکھا تھا۔ اور افتخار کی آمد کے منتظر ہو بیٹھے تھے۔ امیر احمد امریکہ جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے انھیں ایک عمدہ چانس ملا تھا۔ اور اسے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ادھر اماں بیمار تھیں۔ ان کا گھر بکھرتا نظر آرہا تھا۔ اماں کو کچھ ہو جاتا زوبی سسرال کی ہو جاتی تو پھر گھر، گھر نہ رہتا۔ کھنڈر بن جاتا۔ شہیر کا پرسان حال کوئی نہ رہتا۔ اس نے امتحان دے دیا۔ اور اب بے چارہ گرہستی سنبھال رہا تھا۔ اماں کی دیکھ بھال کھانا پکانا۔ عذرا کی بڑی بہن بستر مرگ پر پڑی تھیں۔ وہ وہاں تیمار داری کے لئے چلی جاتی تھیں۔ غرضیکہ امیر احمد بڑی عجوری زندگی گزار رہے تھے۔

ایک دن زوبی کی تباہ حالی دیکھ کر شہیر نے کہا۔ "زوبی تم اب بھی محنت کرو اور دل پر رکھ لو تو جہالت کا کلنک اپنے ماتھے پر سے چھڑا سکتی ہو بس عزم وارادے کی بات ہے سنو فارسی زبان کے ایک شاعر تھے۔ وہ بھی تمہارے ہی ایسے تھے۔ ان کے دماغ میں کوئی بات آتی ہی نہیں تھی۔ چالیس سال کی عمر تک وہ ان پڑھ ہی رہے۔ پھر ایک دن وہ مسجد میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے نل سے پتھر پر مسلسل پانی ٹپک رہا تھا۔ جس نے پتھر کو بھی گھسا دیا تھا۔ تب انھوں نے سوچا کہ کیا میرا دماغ اس پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے جس میں کوئی صلاحیت ہی نہیں۔ بالآخر انھوں نے چالیس سال کی عمر سے پڑھنا لکھنا شروع کیا۔ اور آج دیکھو کہ فارسی زبان کے مشہور شاعر کی حیثیت سے فارسی زبان میں ان کا

ان کی شاعری کا کتنا بڑا مقام ہے۔ ایک درجہ ہے۔ انھیں شہرت ملی ہے۔ تم بھی کوشش کرو زوبی یہ مت سوچو کہ تم پڑھ نہیں سکتیں یہ کہو کہ تم نے پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اب بھی وقت تمھارے ہاتھ میں ہے میری بہن۔ خود کو ضائع نہ کرو میں تمھارے لیے کتابیں لاؤں گا۔ پڑھاؤں گا۔ ایک دن تم تعلیم یافتہ ہو جاؤ گی۔ کیا ابا کا کہنا تمھیں یاد نہیں۔ وہ تمھارے بارے میں فخریہ کہا کرتے تھے کہ ایک دن میری زبیدہ نامور ہستی بنے گی کچھ کر کے دکھائے گی۔ تو کچھ بن کے کچھ کر کے دکھاؤ۔ میری اچھی بہن۔"

اس نے سر ہلایا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "پڑھوں گی شبیر۔ کچھ بننے کی کوشش کروں گی۔"

"اماں نے بھی باسی برتھا کے بہت سمجھایا تھا۔ بیٹی تیرا گھر برباد نہ ہو۔ چپ رہنا سیکھ میری بچی۔ میں نے سہی تیری زبان درازی دوسرے کیوں سہیں گے۔ وہ تو غیر ہیں۔ ان کا دل تجھے مٹھی میں لینا ہے۔ دیکھ زوبی تیرا دکھ مجھے قبر میں پہونچا دے گا۔ بیٹی صبر کر کے دل بڑا کر کے رہنا سیکھو۔ اب وہی تیرا اصلی گھر ہے۔ یہ تو تیرے لئے سرائے ہے۔ آئی اور چلی گئی۔ اور پھر یہاں کا کچھ بھروسہ نہیں امیر احمد اور عذرا چلے جائیں گے شبیر کی شادی ہو گی۔ اس کی بیوی کیسی ملے کیسی نہ ملے۔ کیا تم پھوسڑے والی کی بیوی بچوں کی ماما بنو گی؟ ان کا لیا دیا پہنو گی؟ میرا کیا بھروسہ بیٹی۔ آج ہوں کل نہیں۔ پھر کون تمھارا پرسان حال ہوگا۔ کون دکھ درد کو پوچھے گا۔ ہر کوئی تمھارا اپنا ہوگا۔ بیٹی شوہر چاہے جیسا بھی ہو عورت کے لئے تاج کی مانند ہوتا

رہتے۔ عورت اس قلعے ہی میں محفوظ رہتی ہے۔ تم اب سمجھدار ہو۔ دیکھتی ہو تمہاری بہن اور بھابی نے کس طرح گھر کو جنت بنا رکھا ہے بنانا بگاڑنا تمہارے ہاتھ میں ہے زوبی۔ بناؤ چاہے بگاڑو۔"
ہر طرف کی یورش سے گھبرا کے زبیدہ نے وعدہ کیا۔ کہ اب کی وہ سسرال میں انسان بن کر رہے گی۔ اور ہمیشہ کے لئے لبوں پر تالے ڈال لے گی۔

خط کے جواب میں افتخار آ گئے۔ لیکن بد دل اور مکدر سے۔ رضا کے استفسار پر انھوں نے زبیدہ کی شکایتیں کی تھیں۔ اور وہ سب سچ تھیں۔ اماں سے ملے تھے۔ ان کے گھگھیانے پر انھیں ترس آ گیا تھا۔ لیکن انھوں نے اتنا ضرور کہا تھا۔ کہ وہ ایک بار اچھی طرح زوبی کو سمجھا دیں۔ ان کے والدین سے احترام سے پیش آئے۔ بھائی بہنوں سے زبان درازی نہ کرے۔ اپنا گھر بگاڑنا وہ بھی نہیں چاہتے۔ زوبی تو ان کی پسند تھی۔ وہ اسے چاہتے تھے۔

تنہائی میں زوبی ان سے روٹھ گئی۔ اس کا حق تھا۔ لیکن اس احمق کو گلے شکوے بھی تمیز سے کرنا نہ آئے۔ منہ پھلا کر بولی "لاکے پٹخ دیا اماں کی چھاتی پر ہاں نہیں تو۔ خود کیوں نہیں آئے۔ بڑی محبت جتاتے تھے۔ میں نہیں تھی پاس میں تو نہیں آئی محبت۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ اماں بہن مجھ سے زیادہ پیاری ہیں۔ اکیلے اکیلے میں کتنا روتی ہوں۔ کچھ پتہ بھی ہے۔"
"بھئی دیکھو میری جان۔" افتخار اس کی شکل دیکھ کر پگھل گئے

اسے اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے بولے۔ "تمہارا شکوہ بے جا ہے مجھے تم سے بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی ماں بہن سے ہے۔ اب یہ تو تمہارے ہاتھ میں ہے کہ محبت کی ترازو کو جو برابر ہے ادھر ادھر جھکنے نہ دو۔ اس کے دونوں پلڑے برابر رہیں۔ سمجھیں۔ سوچو ذرا میں نہ تمہیں چھوڑ سکتا ہوں نہ انہیں۔ پھر کیوں نہ تم ان سب سے مل جل کے رہو۔"

"یہی بات آپ نے ان لوگوں کو نہیں سمجھائی۔؟" بڑے دلار سے ان کے گال سہلاتی ہوئی وہ بولی۔

"وہ بڑے ہیں۔ میرا سمجھانا بے ادبی ہے۔" افتخار نے پیار سے کہا۔ "تم میری بیوی ہو۔ میری محرم راز ہو۔ دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ اچھی بری بات کا سمجھانا میرا کام اور سمجھ بوجھ سے رہنا تمہارا فرض ہے۔ ہمارا گھرانہ بہت شریف، بے حد اعلیٰ مانا جاتا ہے۔ ذرا سی ساس بہو کے جھگڑے ہمارے ہاں عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ بھائی جان کی شادی ہوئے تقریباً بیس سال ہو گئے۔ بھابی تین بچوں کی ماں بن گئیں لیکن ہمیں یاد نہیں کہ کبھی ان میں ہم میں مخالفت یا ناراضی کا سوال پیدا ہوا ہو۔ سب اس طرح گھر میں مل جل کے رہتے ہیں۔ جیسے دودھ میں شہد جن کے پھر الگ ہونے کا امکان ہی نہیں۔"

"سنئے جی! میں بھی آپ سے الگ نہیں رہ سکتی۔" وہ ٹھنکی۔

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں!"

"پھر وہاں مجھ پر کوئی ہنسا تو؟"

"اس کا موقع ہی نہ دو!"

"تو پھر میں چلوں آپ کے ساتھ؟"

"ضرور چلو۔ مگر خود کو بدل کے۔"

"کیسے بدلوں؟" حیرت سے اس نے کہا۔ "جو زبیدہ بیگم ہوں۔ وہی تو رہوں گی۔"

افتخار ہنسنے لگے! "بس ایسی ہی حماقت انگیز باتوں پر ثمرہ وغیرہ کو بھی ہنسی آئی ہوگی۔ بیوقوف! میں کیا یہ کہہ رہا ہوں۔ کہ اپنی صورت شکل بدلو۔ میرا منشا کہنے کا یہ تھا کہ اپنی عادتیں بدلو۔ شریف گھرانے کی بیٹی شرافت ہی سے تو سسرال میں رہتی ہے!"

"اچھا۔ اچھا۔"

امیر احمد کچھ خوش تھے کچھ ملول۔ انھوں نے کہا۔ "میں شاید ہفتہ عشرے میں چلا جاؤں۔ عرصے سے کوشش کر رہا تھا۔ اب خدا خدا کر کے نوبت آئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ کوئی بڑی ڈگری ملے تو زندگی میں کچھ پُرسکون ہو۔ ان سالوں میں آج کل گرہستی کی گاڑی کا چلنا بہت دشوار ہے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ ابا مرحوم گھر سلامت رکھ گئے ورنہ سڑک پر آجاتا۔ تم کیا اتنے دن ٹھہر نہیں سکتے۔"

"بھائی اتنے دن ٹھہرا تھا۔ اب ایک ہفتے کا ٹھہرنا کیا۔" افتخار نے کہا۔ "چلو۔ نہیں جانا۔ تمھیں سی آف کر ہی کے جاؤں گا۔"

ان دنوں رضا بھی آئے تھے۔ انھوں نے افتخار کو اکیلے میں بہت سمجھایا۔ اپنی دوستی کا واسطہ دیا کہ ان کی خاطر کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھائیں۔ جو گھروں کی تباہی کا باعث بن جائے۔ افتخار نے وعدہ بھی کر لیا۔ کہ اب جذبات سے الگ ہٹ کر گھر سنبھالیں گے۔

اماں اگرچہ بیمار تھیں لیکن انھوں نے ایک بار پھر افتخار کی خاطر
داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ شاید اس طرح ان کا دل پسیجے۔ وہ
ان کی کنبہ بیٹی کو میکے میں لا کے نہ بٹھا دیں۔ مگر وہ بے چاری یہ
بھول گئیں کہ داماد ہمیشہ داماد ہی رہتا ہے۔ بیٹے کو دھتکار دو پھر
واپس آجاتا ہے۔ داماد کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھو ہمیشہ کے لئے چلا
جاتا ہے۔ بھول جاتا ہے سسرال کے نمک کا ذائقہ۔ افتخار بھی تو
داماد ہی تھے۔

امیر احمد کے جانے کا اثر اماں پر بہت تھا۔ ان کے گھر پر چہل
پہل رہتی تھی۔ مگر یہ سناٹے کی تمہید تھی۔ ان دنوں روزانہ کے ہاں سے
دعوتیں ہوئیں۔ امیر احمد اور عذرا کو کئی بار پھول پہنائے گئے۔ عذرا
اور شائستہ بہت مصروف رہتی تھیں۔ زہرہ بی بی بھی اپنی فکریں بھول گئی
تھی۔ اسے صدمہ بس یہ تھا کہ امیر احمد اور بھابی جان نہ جانے کتنے برسوں
کے لئے جا رہے تھے۔ اور ان کے بعد وہ بھی چلی جائے گی۔ اماں
کی تنہائی کا خیال اسے پریشان کر رہا تھا۔

اور اماں کا کام ہی گریہ و زاری رہ گیا تھا۔ امیر احمد کو روک نہ
سکتی تھیں۔ ان کے مستقبل کا سوال تھا۔ ان کے سامنے دو بچے
تھے۔ تنخواہ کم تھی۔ اس میں گزر بسر کرنا ناممکن ہو رہی تھی۔ اماں ہزار
چاہتیں کہ دل مضبوط کریں مگر ان سے یہ ممکن نہ تھا۔ امیر احمد کی
شکل پر نظر پڑتی اور اماں کا دل بھر آتا۔ کتنا سعادتمند، نیک نفس،
خدمت گزار اور محنتی آدمی تھا۔ ان کے لئے اماں کا رونگٹا رونگٹا
دعائیں مانگتا۔ امیر احمد بھی فکرمند تھے لیکن مجبور بھی تھے۔ اماں

کو تسلیاں دیتے رہتے کہ امریکہ پہنچ کے کچھ ہو گیا تو وہ گھر کی صورت بدل دیں گے۔ اماں اور شبیر کو بھی بلوا لیں گے۔ مگر ماں کا دل ان طفلی تسلیوں سے بہلتا نہ تھا۔

بالآخر ایک دن وہ معہ بیوی بچوں کے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد افتخار نے بھی اجازت چاہی۔

"میاں — !" اماں رو پڑیں۔ "دیکھ رہے ہو کہ میری کیا حالت ہے۔ بیٹے مجھ پر ترس کھانا۔ میرا دل اسی نا سمجھ میں پڑا رہے گا۔ میرے بچے۔ اسے تم جان گئے ہو۔ میری خاطر اس کی غلطیوں کو معاف کرتے رہنا۔ درگزر کرنا۔ ابھی اتنی ہوشمند نہیں۔ آتے آتے سمجھ آجائے گی۔ اس کی جہالت کو نظر انداز کرنا۔"

ایک دن وہ روتی دھوتی زوبی کو لے کر سدھار گئے۔

رضا اور شائستہ پہلے ہی جا چکے تھے۔ ڈھنڈھار گھر میں اماں بولائی سی کھڑی تھیں۔ یہاں وہاں کوئی نہیں۔ نہ عذرا نہ شائستہ نہ بچے نہ زوبی نہ کسی کی کھنکھناتی ہوئی ہنسی کی جھنکار تھی نہ مردوں کی آوازیں تھیں نہ بچوں کا شور کہیں کچھ نہیں۔ دالان میں ہوا دیوانی سی لوٹیں لگا رہی تھی۔ دروازے زور زور سے کھل رہے تھے بند ہو رہے تھے۔ ٹھہرا ہوا سا سرمائی دن بیمار کی سی سانس لے رہا تھا۔ مریض دھوپ کوٹھے کی دیوار پر سے رینگتی نیچے اتر رہی تھی کیتنی سنسانی تھی۔ کتنی وحشت کتنی تنہائی سب اپنے اپنے گھر بار کے تھے۔ مصروف تھے۔ گھر کی تنہائی سے گھبرا کر شبیر دوستوں میں جا بیٹھا تھا۔ اماں نے وضو کیا اور جانماز پر آکے سجدے

میں گر گئیں مگر سمجھ میں نہیں آیا کس کے لئے دعا مانگیں۔ انھوں نے گھبرا کر اپنے لئے دعا مانگی۔

"اے اللہ میرے دل کو چین دے، سکون دے۔ قرار عطا کر۔"

اور بس رونے لگیں۔ کچھ دنوں حالات بدستور رہے۔ رفتہ رفتہ اماں کے دل کو بھی صبر آتا گیا۔ امیر احمد نے امریکہ سے اور افتخار نے نظام آباد سے خط لکھے تھے۔ دونوں مزے میں تھے۔ اماں نے رضا کو بلا کر خط دکھائے وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ ایک دفعہ رضا اور شائستہ نظام آباد آ گئے تھے۔ وہاں انھوں نے زوبی کا رہن سہن دیکھا تھا شائستہ بہت خوش ہوئی تھیں۔ ان کی بہن شہزادیوں کی طرح رہتی تھی۔ اب اس نے زبان کو قابو میں کر رکھا تھا۔ بڑوں کا ادب کرنے لگی تھیں۔ فی الحال اس سے کسی کو اگر محبت اُنس نہ تھا تو واضح طور پر کچھ گلہ بھی نہ تھا۔

افتخار بھی مطمئن تھے۔

لیکن ان کی والدہ مجتہرہ اور مہر النساء کے دلوں سے عناد کا زہر نہ نکلا تھا۔ بیگم صاحبہ کو اپنی بہن کی خفگی کا بے حد ملال تھا۔ وہ عہد شکن اور جھوٹی بنی تھیں۔ ہم چشموں میں ان کی ناک نیچی ہو تی تھی وہ افتخار سے بھی پہلے کی طرح بولتی نہ تھیں۔ مہر النساء کا حال یہ تھا کہ ماں کے منہ سے بولتی ماں کے دماغ سے سوچتی۔ اور ماں کے اشارے پر ناچتی تھیں۔ لہٰذا اماں کا رنج و غم ان کا بھی تھا۔ وہ بھی بھائی بھاوج سے نالاں تھیں۔

ماں اور نانی کی سرگوشیوں میں ثمر بھی برابر کی شریک تھی۔ اسے تو

یہ بھی جلن تھی کہ صورت شکل میں وہ زوبی سے کہیں کم تھی۔ اس کے پاس دولت تھی۔ شان تھی۔ تعلیم تھی۔ مگر صورت نہ تھی۔ جب کہ اپنی شکل ہی سے جاہل زوبی اپنے پرائے کو دیوانہ بنا سکتی تھی۔

بیگم صاحبہ اور مہرالنساء تو صرف پوشیدہ دشمنی ہی کی حد تک رہ گئیں۔ لیکن ثمر کا رشک و حسد رنگ لایا۔ وہ گریجویشن کر رہی تھی۔ اور انگریزی میں کمزور تھی۔ چنانچہ ایک نوجوان فلسفی ایبل لیکچرر صاحب اس کو انگریزی پڑھانے تشریف لاتے تھے۔ پہلے پہل شہریار یا اس کا چھوٹا بھائی شہباز ۔۔۔ ان کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن جب سے محترمہ زوبی نے بھی خیر سے پہلی کتاب لے کے ان کے پاس بیٹھنا شروع کیا تھا شہباز کی نگرانی ختم ہو گئی تھی۔ سلمانہ کا لڑکا بھی انہی سے پڑھنے لگا تھا۔ ثمر کا "معاملہ" اپنے استاد سے نجانے کب سے چل رہا تھا۔ لیکچرر صاحب واقعی زاہد خشک ہی تھے۔ ثمر کے ناز و انداز کے مقابلے میں ان کا سلوک کچھ سرد ہوتا تھا۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ ان کی دلچسپی یکبارگی بہت بڑھ گئی۔ ثمر حیران تھی۔ تحقیق پر پتہ چلا کہ ناصر صاحب کی دلچسپی اس سے کم اور زوبی کی حسین پرکشش ذات سے زیادہ تھی۔ ورنہ وہ کیا اور اس کی پہلی سی پڑھائی کیا۔؟

رقابت کی آگ نے اسے پھونک دیا۔ اب وہ دونوں سے بدلہ لینے کے لئے دیوانی ہو رہی تھی۔ اس نے زوبی سے بے تکلفی بڑھائی :۔ اس سے بولی۔

"مامی جی۔ تم کتنی حسین ہو۔ مگر تمھیں اندازہ نہیں ذرا بناؤ سنگھار کیا کرو تو قیامت نظر آؤ۔ مامون بھی دل تھام کے رہ جائیں۔ یہ اتنے

اجڑی اجڑی کیوں رہتی ہو۔ اچھے اچھے کپڑے پہنا کرو۔ خوبصورت زیور پہنو۔ وہ کس دن کے لئے رکھے ہیں۔ یہ اتنے لمبے لمبے بال اگر مجھے ملے ہوتے تو میں ایک ایک کو قتل کر دیتی۔ تمہیں قدر نہیں۔ اب تو تم باہر پڑھنے بھی جاتی ہو۔ کیا سوچیں گے ناصر صاحب کہ۔ اتنے بڑے گھر کی بہو اس حالت میں رہتی ہے۔ تمہیں اپنی شان کا خیال رکھنا چاہیئے۔ گھر میں تمہارا یہ حلیہ چل جاتا ہے مگر باہر والے کیا خیال کریں گے۔ یہ نواب بہادر مقصود احمد خاں کی بہو ہے۔ واہ۔ مامی ـــــ!"

"سچی۔" زوبی یہ سوچ کر خوش ہو گئی۔ کہ آخر کار اس کی دشمن اتنی دوست بن گئی تھی۔ اس نے خود ہی بھرپور جوانی زوبی کا سنگھار کیا تھا۔ اور وہ قیامت بن گئی۔ لیکن جب ناصر نے اسے دیکھا اور دل تھام کر رہ گئے تھے۔ اب انہیں بھی ڈر کیا پڑا تھا کہ وہ اپنا پڑھا لکھا جوڑا پا چکی ہے۔

"بہت حسین ہو نا۔" ثمر مسکرا رہی تھی۔

"جی۔ جی ہاں مگر۔ وہ آپ اپنی پڑھائی کیجئے نا۔ کیا بیکار باتیں آپ نے شروع کر دیں؟" وہ گھبرا کر بولا۔۔۔

"میں تو کسی قابل نہیں جناب!" ثمر نے نخرہ دکھایا۔ "مگر ان پر بھی دانت نہ رکھئے۔ بڑے گھر کی چھوٹی بہو ہیں۔"

"لا حول ولا قوۃ۔ ثمر! آپ کے خیالات بہت واہیات ہیں۔" ناصر نے کہا۔ "میں اس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتا۔ آپ صرف اپنے کام سے کام رکھئے۔"

دو تین روز ثمر نے ورغلا کر زوبی کو میک اپ پر مجبور کیا تھا۔ اس کا بننا سنورنا سب ہی نے حیرت سے دیکھا۔ اپنے ہونٹ اس نے کبھی بھی سرخ نہ کئے تھے۔ نہ کہ اب گہرا قسم کی لپ اسٹک لگانے لگی تھی۔ افتخار تک کو حیرت تھی۔ خود کو سنوارنے کا شعور اس میں کیونکر پیدا ہوا تھا۔

ثمر کو اپنی محبت میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ناصر کی خوب روئی پر لٹو تھی۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ وہ آواز کی دیوانی تھی۔ لیکن ناصر نے پہلے پہل حوصلہ افزائی کے بعد بیزاری کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ اسے اپنے ایک ہزار کی خاطر ثمر کے جاگیردارانہ غمزے بھی برداشت کرنے پڑے تھے۔ زوبی کے تعلیم میں دلچسپی لینے کے بعد وہ بھی ختم ہونے لگے۔ ثمر کو حسد نے پھونک رکھا تھا۔ وہ موقعہ کی تلاش میں تھی۔ اسے موقعہ بھی مل گیا۔

بیگم صاحبہ نے افتخار کی موجودگی میں ثمر سے پوچھا "یہ بجاؤ لیکھ کچھ پڑھتی بھی ہے۔ کہ مٹی کی مادھو بنی بیٹھی رہتی ہے۔ مفت کے چار سو پھونک رہے ہیں۔"

"امی جان کون بڑی رقم ہے۔ آپ کو خیال ستا رہا ہے۔ اچھا ہے نا کچھ سیکھ لے۔" افتخار نے کہا۔ ماں کی کنجوسی انھیں ناگوار گزری۔

"میں کیا جانوں نانی اماں۔ آپ ماسی سے سن لیجئے انھوں نے کیا پڑھا ہے۔" بے رُخی سے ثمر بولی۔ "میں کچھ کہوں گی تو ماما جی میری کھال کھینچ لیں گے۔ میں تو خاموش رہوں گی۔"

"کیا بات ہے؟" افتخار نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"کچھ نہیں ماما جی!" ثمر نے اداکاری کی جیسے بہت خائف ہو گئی ہو۔

"ارے بیٹی! کیا بات ہے۔ کہو نا۔" بیگم صاحبہ نے تعجب سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "خاموش ہی رہنا تھا۔ تو اتنا بھی کیوں کہا۔"

"بتاؤ ثمر۔" افتخار نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"ماما جی! وہ۔ مامی۔ ناصر صاحب ہیں۔ ضرورت سے زیادہ ہی دلچسپی لے رہی ہیں۔" رک رک کر ثمر نے کہا۔ "آپ دیکھتے نہیں۔ صرف الم غلم پڑھنے کے بہانے وہ کتنا ان سے چمٹی جاتی ہیں۔ میں نے کتنا منع کیا کہ مامی آپ ایک بڑے گھر کی عزت ہیں۔ آپ کی شان سیدھا سادہ رہنے میں ہے۔ مگر انہوں نے کسی کا کہا بھی مانا ہے۔ جو میرا مان لیتیں۔ میں بھی کیوں بار بار کہہ کے بری بنتی چپ ہو رہی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟" بیگم صاحبہ نے دنگ ہو کر پوچھا۔ "کیا سچ ہے ہاں۔ دیکھتی تو ہوں میں بھی۔ یونیورسٹی پر موٹی غلیظ جانور کی چربی سے نئی سرخی پوت لیتی ہے۔ کوئی بنارسی کپڑے پہن کر پڑھنے جاتا ہے۔ افتخار یہ کیا قصہ ہے۔ تم نے کیوں آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ بھلا صاحبزادی ہیں یہ گن بھی ہیں۔ خدا غارت کرے اس کمبخت کو!"

افتخار کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ ایک جا رہا تھا۔ آنکھیں

سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ کہے بغیر اٹھ گئے۔ ناصر کے آنے میں کچھ دیر تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ زوبی نے بہت قیمتی بنارسی ساری باندھ رکھی تھی۔ بدن پر وہ زیور لاد رکھا تھا۔ اور بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ بے پناہ غصّے کو افتخار نے ضبط کر کے پوچھا۔

"کہیں جا رہی ہو کیا۔؟"

"ہاں" وہ مست مورتی کی طرح تھرکی!

"کہاں ہے" شک کے شعلے افتخار کے دل میں اونچے اٹھنے لگے!

"پرے جیسے اور کہاں" وہ گھوم کر ان کی گود میں آ گری۔ بے خود ہو رہی تھی۔ اسے باہوں پر جھیلتے ہوئے افتخار نے پوچھا۔۔

"ایسے کپڑوں میں۔ جو شادی بیاہ کے موقعوں پر پہنے جاتے ہیں۔ یہ بھاری بھاری زیور۔ گلوبند۔ بندے اور ہیرے کی انگوٹھی!"

"ہاں جی۔ اچھی جو لگتی ہوں۔" وہ ان کی گردن میں باہیں ڈال کر جھومنے لگی۔ اور شک کے شعلوں نے افتخار کو بھسم کر دیا۔ اس نے اس عرصے میں ان سے تو کبھی ایسا دلار نہ بگھارا تھا۔ اب کیا ہوا۔؟

"تمہیں ابھی لگ کے کیا کرنا ہے زوبی" افتخار نے کہا۔

"اے لیجئے کرنا کیا ہے" اس نے قہقہہ لگایا۔ "ہمارا اپنا جی خوش ہوتا ہے۔ اور کیا" اس شام افتخار نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ زوبی اجنتا کی مورتی بنی ناصر کے سامنے بیٹھی تھی۔ کتاب اس کے سامنے کھلی رکھی تھی۔ اس کی نظریں بے شک کتاب پر تھیں۔ مگر ناصر کی آنکھیں اس پر تارہ بن کر لگی ہوئی تھیں۔ جیسے

نظروں نظروں ہیں اسے کھا رہا تھا۔ پی رہا تھا۔ دل میں اتار رہا تھا۔ کیا افتخار کا حال ایک دن خود بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ان کا تن بدن بھڑکنے لگا۔ پھر بھی دو دفعہ وہ خاموش رہے۔ تیسرے دن جب وہ اعلیٰ درجے کی ساری پہنے اور تراما چندن ہار گلے میں ڈالے اور کتاب سنبھالے باہر قدم بڑھا رہی تھی۔ یکبارگی گھر بھر کے لوگ ایک فوج کی طرح اس کے سامنے آکر صف بستہ ہو گئے۔!

"ذلیل۔ بے شرم۔ بے حیا۔ افتخار کا ہاتھ اس کے رخسار پر پڑا۔ اور پانچوں انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔ پھر ان کا ہاتھ ایک بار اٹھا۔ تو دیر تک نہیں رکا۔ وہ پٹ رہی تھی چیخ رہی تھی مگر کسی نے اسے نہ بچایا۔ وہ بیگم صاحبہ کی طرف پناہ لینے بھاگی انھوں نے اسے پھر انساء کی طرف ڈھکیل دیا۔ انھوں نے اسے روک کر سلمانہ کی طرف بڑھا دیا۔ اور جب وہ نیم بیہوش سی انتصار احمد کے قدموں میں گر گئی۔ تو انھوں نے اپنے پاؤں اس کے جسم سے ہٹا لیئے۔ افتخار فرط غیظ سے ہانپ رہے تھے۔ "جان سے مار ڈالوں گا اسے! زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیا کمی کی تھی ہم نے کہ اس کمینی نے دو ٹکے کے ماسٹر سے پینگیں.. بڑھائیں۔ معلوم نہیں یہ قصہ کب سے چل رہا تھا۔ اگر بے چاری قمر نہ کہتی تو حویلی کی عزت نیلام ہو چکی ہوتی۔ اب بھی مجھے یہ پتہ نہیں یہ ذلیل فاحشہ میرے قابل رہ بھی گئی ہے یا نہیں۔ اب اسے ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا۔ غلاظت گندگی کی گٹھری ہے۔

اسے بھجوادیجیے۔ اس کی ماں کے گھر۔ آج سے یہ میری کوئی نہیں۔ میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"میاں یہی ہوتا ہے۔ خان بہادر صاحب عرق عرق ہو رہے تھے۔" امیر و غریب کا میل ناممکن ہے۔ ہم تمہیں کچھ سوچ ہی کے منع کر رہے تھے۔ تم نے ایک ضد اٹھائی تھی کسی کی نہ سنی بہر حال اب آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگلی جائے گی۔ یہ شروع ہی سے افتخار کے قابل نہیں تھی۔ ان کی ضد ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہم نے گوارہ کر لیا تھا۔ لیکن اب نہیں۔ شیخ میراں سے کہو۔ گاڑی زنانی گیٹ پر لائیں۔ اور بوا شریفن کو ساتھ کر کے ابھی اسی وقت حیدر آباد بھجوا دو۔ میں حویلی کو مزید گندہ کرنا نہیں چاہتا" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

"موئی حرافہ۔ بدذات۔ لاخیری کہیں کی۔" بیگم صاحبہ نے فرمایا۔

"کتے کو گھی کب پچا ہے امی جان" مہرالنساء بولیں۔

"میں تو اسے اپنی دیورانی کہتے شرماتی تھی" سلمانہ نے کہا۔

"اب افتخار کی آنکھیں کھلیں گی۔ اس کی تائید میں سب سے لڑتا تھا۔" انتصار صاحب نے فرمایا۔

کچھ دیر بعد زوبی کو ہوش آیا۔ مگر بیہوشی سے بدتر لگ رہی تھی۔ خاک میں سنی ہوئی لال لال آنکھیں۔ گال متورم۔ ہونٹوں پر خون جما ہوا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھا۔ اور اٹھ بیٹھی سر چکرا رہا تھا۔ چہرہ جس پر افتخار کے ہاتھ برسے تھے جل رہا تھا جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس نے زمین پر سر جھکا دیا۔

"ابھی اور اسی وقت چلی جا یہاں سے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ "اگر اپنی خیر چاہتی ہے تو ـــــ"

"کیا کیا ہے میں نے؟" وہ چیخی اور لڑکھڑا کر کھڑی ہو گئی۔ "کیوں مارا ہے مجھے۔ بتاؤ۔ میرا قصور کیا ہے۔ گھر سے نکالنا تھا۔ یونہی نکال دیتے۔ مجھے مارا کیوں؟" وہ بلک بلک کر رو پڑی۔

"بڑی پتی ورتا ہے۔ کہ مجھے سر پر بٹھا لیتے؟" مہرالنساء کیوں پیچھے رہتیں۔ "ذلیل فاحشہ کہیں کی۔ ہم سے پوچھتی ہے کہ قصور کیا ہے۔ ہم تجھ سے پوچھتے ہیں۔ اس فقیر بچے ماسٹر سے کب کی لگی تھی تیری کیوں بن سنور کر حرّافہ اس کی گود میں جا بیٹھتی تھی۔ ارے کیسے گندے لچھن ہیں مالزادی کے۔ ہمارا تو گھر غلیظ ہو گیا۔"

"مجھ سے تمر نے کہا تھا کہ ا" وہ حلق پھاڑنے لگی تھی کہ جلتے ہوئے چہرے پر مہرالنساء کا ایک ہاتھ اور پڑا اور وہ تیورا کر ایک بار پھر گر گئی۔

"حضور زنانہ گیٹ پر گاڑی آگئی ہے!" شیخ مہراں گھگھیائے۔

"لے جاؤ اسے۔ پہونچا دو اس کی ماں کے گھر۔ کہہ دینا اس بڑھی سے کہ خوب تو نے اپنی کھائی کھیلی لڑکی کو افتخار کے سر منڈھا تھا۔ ہم تو اس کی ہر بیہودگی برداشت کر رہے تھے۔ لیکن حرام کاری تو برداشت سے باہر ہے۔ لے جاؤ شریفن بی لے جاؤ۔"

"مردار اپنی ناپاک زبان سے تمر کا نام لے رہی ہے۔" مہرالنساء نے دانت پیس کر کہا۔ "ارے اس کی جوتیوں کی برابری تو کر لے۔"

شریفن بی اس کا بازو پکڑ کر زمین پر سے اٹھانے لگیں۔ وہ

بکھر گئی۔ "نہیں نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ خدا کی قسم کھاتی ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔" لیکن وہاں تو سب بہرے کھڑے تھے جن کے دل کے کان بہرے ہو چکے تھے۔

شریفن کے سنبھالے وہ سنبھل نہیں رہی تھی۔ چنانچہ ایک طرف سے مہر النساء نے مدد کی۔ اور اسے ڈھکیلتے گھیٹتے وہ لوگ باہر نکال لائے۔

"وہ کہاں ہیں؟" زوبی بپھری جا رہی تھی۔ "انہیں بلا دو۔ وہ مجھے بچا لیں گے۔ کہاں ہیں وہ۔ ہائے اللہ۔ تو دیکھ رہا ہے۔ ارے تم لوگ کبھی اچھے نہ رہو گے۔ مجھ بے قصور پر ایسا ستم کیا ہے۔ اللہ تم سب کو غارت کر دے گا۔ کبھی خوش نہ رہو گے۔ تم پر بجلی گرے گی۔ ارے ظالمو، تم سب کا ناس جائے۔ میں تو۔ ایک۔ خوشخبری سنانے والی تھی۔ یا خدا۔ یہ حویلی ترس جائے اپنے وارثوں کو۔ اے اللہ تو دیکھ رہا ہے۔" زبردستی وہ گاڑی میں ٹھونس دی گئی۔ شریفن بی پاس بیٹھیں اور روتی بلکتی اور فریاد کرتی ستم رسیدہ زوبی کو لے کر گاڑی ہوا ہو گئی۔

صدیوں کی طویل بے ہوشی کے بعد اسے ہوش آیا تھا۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر چاروں طرف دیکھا۔ اماں کا غمزدہ بیمار چہرہ اس کے سامنے تھا۔ جس پر موت کی سی سردی چھا رہی تھی۔ رعنا اور شائستہ

اور شہیر کے اداس و حیران چہرے پر وہ ہانپنے لگی۔ صدمے سے فرطِ غیظ سے۔ اس نے مٹھیاں کس لیں۔

"بیٹے! یہ کیا ہوا۔" اماں کے منھ سے بات نکلنا دشوار تھی۔ "شریفن نے بہت تفصیل سے مجھے ساری باتیں سنائی تھیں۔ بیٹی کیوں کیا تم نے ایسا۔ غیر مرد کے سامنے بن سنور کر ——!"

"میں افتخار کو ایسا سطحی اور کمینہ آدمی نہیں سمجھتا تھا۔" رضا بے حد نادم ہو رہے تھے۔ "اب میں خود جاؤں گا وہاں اور پوچھوں گا اس بدنہاد سے کہ صرف چھ سات ماہ کے عیش کی بنا پر کم بخت تو نے ایک معصوم کی زندگی کیوں برباد کی۔"

میں مار ڈالوں گا جان سے افتخار کو۔" شہیر آگ ہو رہا تھا۔ "اس نواب زادے کا جی اس مظلوم سے بھر گیا تھا۔ تو یونہی نکال دیتا اس پر بہتان کیوں رکھا۔ اسے ذلیل کیوں کیا۔ اسے مارا پیٹا کیوں؟"

"ایک خط لکھ کر افتخار صاحب کو یہاں بلائیے۔" شائستہ اپنی بہن کی حالت دیکھ دیکھ کر آنسو بہا رہی تھیں۔ "ہم ان سے پوچھیں کہ ایسی شرمناک تہمت انھوں نے بے گناہ ناکردہ کار پر کیوں رکھی ہے۔"

"اب کیا ہو گا۔" اماں نیم جان تھیں۔ "امیر پردیس میں ہیں۔ رضا مصروف رہتے ہیں۔ شہیر کسی شمار قطار میں نہیں۔ اس بدنصیب ناشاد کا پرسانِ حال کون ہو گا۔ کیا کرے گی اب یہ بدقسمت!"

"نہیں۔" اچانک زوبی بڑے پختہ لہجے میں بولی۔ "کوئی نہ جائے وہاں۔ دولہا بھائی نہ آپ۔ نہ شہیر تم۔ کوئی جاگیردار دوں

کے پاس فریاد لے کے نہیں جائے گا۔ میں اپنے مرحوم ابا کی قسم دیتی ہوں آپ سب کو ان کے پاس کوئی نہ جائے۔ میری آہ اللہ کے پاس پہونچی ہے۔ بدلہ لینے والا سب سے بڑا بادشاہ آسمانوں پر بیٹھا ہے ہم اپنی چھوٹی آنکھوں سے ظالموں کا ظلم دیکھ رہے ہیں۔ وہ اپنی بڑی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ امّاں صبر کیجئے۔" اور اس نے ایک آہ بھر کر سر زانوؤں پر جھکا لیا۔

"کیا کروں۔ اس کا دوسرا تیسرا مہینہ ہے۔ امّاں نے پژمردہ آواز میں شائستہ سے کہا۔" اس کا بھی خیال نہ کیا افتخار نے۔ میاں بیوی میں جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ایک معمولی سی بات کو پہاڑ بنا کر اس طرح کا ستم تو کوئی نہیں کرتا۔ شکر ہے کہ طلاق نہیں دی۔ ورنہ آگے کا راستہ بھی بند ہو جاتا۔

"اس خوش فہمی میں نہ رہیئے گا امّاں۔" رضا نے زہر خند کرتے ہوئے کہا۔ "ان صورت حرام نواب زادوں کے لئے شادی اور طلاق ایک کھیل ہے۔ آج کل میں طلاق نامہ بھی آجائے گا۔ آپ ابھی سے دل مضبوط کر لیجئے۔ بعد کو صدمہ نہ پہونچے۔"

"سنئے! یہ سارے حالات بھیا کو لکھ بھیجئے۔ شائستہ نے کہا۔

"نہیں باجی نہیں۔" زوبی دفعتہً بولی۔ "وہ ہم سے دور ہیں یہ حالات سن کر ان کا سکون ملیا میٹ ہو جائے گا۔ ان کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ اگر وہ یہاں آ بھی گئے تو کیا کریں گے۔ کیا آپ چاہتی ہیں بھیّا کا سا آن پرست خود دار آدمی میری خاطر ان

بادماغوں کے سامنے جھولی پھیلائے رحم کی بھیک مانگے ۔
خوشامد کرے ۔ گڑگڑائے ۔ باجی ۔ بھیا کو کچھ بھی معلوم نہ
ہونا چاہیئے ۔"
رضا اور شائستہ نے اسے دیکھا ۔ بڑی سنجیدہ باتیں کر رہی
تھی ۔ ناسمجھی ۔ بچپنے کا شائبہ تک لب و لہجے میں نہ تھا ۔
اکیلے میں شائستہ نے اس سے پوچھا ۔" افتخار کو معلوم تھا
کہ تم ان کے بچے کی ماں ——— ؟"
" نہیں " زوبی نے خشک لہجے میں کہا ۔" میں نے بتایا ہی نہیں "
" تم نے بتایا ہوتا ۔ شاید اسی بات سے سنگدل پسیج جاتا "
" اس کا پسیجنا لے کر اب کیا کرنا ہے باجی ۔ میں تو اب وہاں
قدم بھی نہیں رکھوں گی ۔" زوبی میں ایک نیا عزم جاگ اٹھا ...
" میں نے اپنی سب غلطیاں مان لیں ۔ بدل لیا تھا خود کو ۔ زبان
پر تالے ڈال لئے تھے ۔ ان سب کی خدمت میں اپنی عظمت
تلاش کرتی تھی ۔ سب کے کہنے پر پڑھنے بھی لگی تھی ۔ تھوڑا بہت
سیکھ بھی گئی تھی ۔ مٹانا چاہتی تھی اپنے ماتھے سے جہالت
کا نشان ۔ جہالت کی شرمندگی ۔ مگر مجھے ثمر نے بہکایا اور اس
کی باتوں میں میں آ بھی گئی تھی ۔ لیکن اتنا بڑا بہتان ——— اُف
خدایا ۔ نہیں باجی ۔ اب میں خود کو اور بدلوں گی ۔ پھر کسی کو یاد
بھی نہ رہے گا کہ یہ تعلیم یافتہ ۔ تمیز دار لڑکی ۔ ذہنی زیادہ
ہے ۔ جو ایک دن جاہل تھی ۔ جاہل " اس نے دانت پیسے "
" بس یہی کہتا ہے شبیر ۔ انسان کا ذہن تجربہ سے زیادہ سخت نہیں

جو نہ کسی سے نہ پگھلے۔ متاثر نہ ہو۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ باجی۔ کیا میرے سر پر خدا نہیں ہے۔ اب آپ سب خاموش رہیئے۔ اور تماشہ دیکھئے۔"

"زوبی! کیا کرنے والی ہو تم؟"۔ شائستہ خائف ہو گئیں۔"اماں پر رحم کرنا میری بہن۔ کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھانا۔ اماں پھر زندہ نہ رہیں گی۔"

"نہیں باجی"۔ وہ زہریلی ہنسی ہنس دی۔"میں خودکشی نہیں کروں گی۔ اب تو مجھے اپنے پیارے ابا کے خواب کو پورا کرنا ہے انھوں نے کہا تھا کہ ایک دن میں کچھ بنوں گی۔ اب مجھے کچھ بننا ہے باجی۔"

"خدا تمھارا مددگار ہو زوبی! تم کتنی بدل گئی ہے۔"شائستہ دکھ سے رو پڑیں۔ اماں اگرچہ سب کے سامنے مضبوط بننے کی کوشش کرتی تھیں۔ مگر اندر اندر نمک کی ڈلی کی طرح پگھل رہی تھیں۔ پہلے ہی ان پر ڈپریشن کا ایسا سخت حملہ ہوا تھا۔ کہ ہر دن مردے کی طرح بے حس و حرکت پڑی رہتی تھیں۔ پھر نئی امیدیں خوش آئند مستقبل کا تصوّر انھیں اٹھا کر کھڑا کر دیتا تھا۔ اب ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اماں نیا دکھ لے کر بستر پر گریں تو پھر کوئی نئی امید انھیں کھڑا نہ کر سکی۔ ان کی بیماری بڑی پریشان کن تھی۔ رضا اور شہیر بھاگ کر ڈاکٹروں کو لاتے تھے علاج تبدیل ہو رہا تھا ان کے پاس اپنے تیماردار تھے۔ مگر اماں کی ہر آس ٹوٹ چکی تھی۔ وہ مردوں سے بدتر تھیں۔ ہر وقت گم صم بستر پر پڑی رہتیں

جیسے دماغی توازن ہی کھو چکی تھیں۔ زبیدہ پر نظریں پڑتیں تو انھیں ایسا ہی لگتا کہ وہ ایک شکستہ کشتی کی مانند ہے۔ جو سمندر کی طوفانی بے رحم لہروں پر ساحل سے بڑی دور نجانے کدھر بہی چلی جا رہی تھی۔ آگے چل کر کون سے گرداب بلا میں اسے چکرانا تھا۔ یہ تو خدا جانے۔ طرح طرح کے ہولناک اندیشے ان کا رہا سہا خون سکھا رہے تھے۔ بالآخر ایک زبردست دورے کے بعد ڈاکٹروں نے ناامیدی کا پیغام سنا دیا۔

اماں جن کی ساری زندگی دکھوں سے عبارت تھی۔ وہ زندگی سے ہار کر موت کے دامن میں پناہ لینے چلی گئیں۔

پاگل پن زوبی سے کچھ ہی دور تھا۔ ایسے میں رضا نے اسے تھام لیا۔ بے حد پیار سے اسے سمجھایا تھا۔

"مصیبتیں سب پر آتی ہیں زوبی۔ تم اگر خود کو غموں کے حوالے کر دوگی۔ تو زندگی دوزخ ہو کر رہ جائے گی۔ تمھیں اس بے درد دنیا میں رہنا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرو۔ یہ تو سوچو کہ جس خدا پر تمھیں اتنا بھروسہ ہے۔ اس نے تمھیں اسلئے پیدا نہیں کیا کہ ضائع کر دے۔ زوبی تمھیں ابا کا خواب تعبیر کی صورت میں ڈھالنا ہے۔"

اور پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں کھلیں! اس نے اپنے گرد و پیش دیکھا۔ گہرا سناٹا۔ تاریکی۔ تنہائی۔ بے سہارا پن۔ اس کی نظریں بے کراں آسمان پر لگ گئیں۔ مالک مجھے بھلا نہ دینا۔ میرے دل میں طاقت دے۔ اور پہلی اور آخری بار بے اوسان ہو کر رو دی ہو گی۔ پھر پُر سکون

شہیر نے گریجویشن میں ٹاپ کیا تھا۔ اسے سرکار سے باہر جانے کا وظیفہ ملا۔ وہ خوش تھا۔ مگر اپنی خوشی سے گھبرا بھی رہا تھا۔
گریجویشن میں ٹاپ کرنا کیا ہوتا ہے شہیر؟ زوبی نے پوچھا۔ دیکھ رہی تھی کہ شہیر گم صم تھا۔ کسی سوچ میں کھویا ہوا۔

"زوبی میں اپنے شہر اور ناگپور میں بھی فرسٹ ان فرسٹ پاس ہوا ہوں۔" شہیر نے کہا۔ "مجھے باہر جانے کا وظیفہ ملا ہے سرکار سے پچیس ہزار روپے۔"

"سچی؟"

"ہاں۔!"

"تو شہیر تم ضرور جاؤ۔" زوبی نے کہا۔ "اللہ تمہیں بہت بڑا آدمی بنائے۔ ابا کی روح کتنی خوش ہوگی۔ ہائے میری اماں بھی یہ خوشی دیکھ سکتیں۔"

"نہیں بہن۔ میں نہیں جاؤں گا۔" شہیر نے اس کے گال اپنے ہاتھوں میں دبا لئے۔ "تمہیں اس حال میں چھوڑ کر جانا پڑے ۔۔۔ ملے سرے کی ۔۔۔۔۔۔!"

"شہیر دیکھ۔ دیکھ بھیا۔ زمانے نے مجھے سبق سکھا دیا ہے۔!" اس کے ہاتھ چوم کر زوبی نے کہا۔ "اب میں ناسمجھ احمق لڑکی نہیں سو برس پرانی روح ہوں۔ جیسے دنیا کا بہت اچھا تجربہ ہے شہیر کوئی انسان کسی کا ساتھی نہیں بھیا۔ ساتھی تو عرش پر بیٹھا ہے۔ سب سے بڑا سہارا وہی ہے ہمیشہ اپنے پاس رہتا ہے۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر جگہ۔ ہر وقت۔ تم جاؤ میرے بھیا۔ ضرور جاؤ۔

تمھیں بھی دنیا میں کچھ کرنا ہے۔ تم بڑے آدمی بن کر آؤ گے۔ تمھاری شادی ہوگی۔ بچے ہوں گے۔ ان سب کے لئے تمھیں خود کو بنانا ہے۔ اور میرے لئے بھی۔ یہاں رہ کر تم اپنے لئے میرے لئے کچھ نہ کر سکو گے۔ میری خاطر باہر جاؤ شبیر! تمھیں میری جان کی قسم"

"یہ کیا کیا زوبی۔ اپنی قسم کیوں دے دی۔ تم اکیلی کیسے رہو گی؟"

شبیر نے کہا۔

"اکیلی نہیں رہوں گی!" زوبی نے کہا۔ "میں نے کل ہمسائی چچی بی سے بات کی تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ اگر تم پڑھنا چاہتی ہو۔ تو تعلیم بالغان کے ادارے میں شریک ہو جاؤ۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔ آپ کر دیجئے وہ مجھے لے جائیں گی۔ میں اب ادارے میں داخل ہو جاؤں گی پڑھوں گی۔ اب میں جاہل کہلانا نہیں چاہتی۔"

شبیر رونے لگا۔ "زوبی تم اتنی سنجیدہ ہو گئی ہو۔ اچھی نہیں لگ رہی ہو۔ زوبی تم پرانی زوبی ہی اچھی لگتی تھیں لڑنے جھگڑنے روٹھنے چیخنے چلانے والی بے وقوف سی لڑکی۔ زوبی تم ایسی باتیں نہ کرو۔ لڑو جھگڑو مجھ سے۔ زوبی تم خود کو نہ بدلو۔"

"نہ رو بھیا نہ رو۔" اس نے اسے گلے لگا لیا۔ "اب ہم دونوں خود کو بدل لیں گے۔ اچھا تم اپنا سامان ٹھیک کرو۔ تمھیں نہ دوبارہ جانا ہے؟"

"ضد کر رہی ہو۔"

"ہاں۔ ورنہ پھر لڑائی جھگڑا!"

شہیر ہنسنے لگا۔ رضا اور شائستہ شہیر کی اعلیٰ کامیابی سے بیحد خوش تھے۔ رضا نے ایک تفصیلی خط افتخار کو لکھا تھا۔ ذکر کر دیا تھا کہ وہ عنقریب باپ بننے والے ہیں۔ مگر افتخار نے جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی!

رضا اور شائستہ نے جب سنا کہ زوبی شہیر کو اپنی جان کی قسم دے کر باہر بھجوا رہی ہے۔ تب وہ بہت ناراض ہوئے۔ شہیر سال بھر بعد بھی جا سکتا تھا۔ لیکن فی الحال زوبی کی پوزیشن کی خاطر اسے اسکے پاس رہنا تھا۔ تب اکیلے میں وہ شائستہ پر بگڑ اٹھی۔

"کیوں روک رہی ہیں آپ انھیں۔ کیا کام ہے انھیں یہاں۔ میرے ساتھ نرسنگ ہوم جائیں گے۔ بچے کو گھٹی منا کے پلائیں گے اس کے کپڑے بدلوائیں گے۔ گھر میں بیٹھ کر پان سینکیں گے۔ آخر عورتوں کے کام میں وہ مرد آدمی حصہ کیا بٹائیں گے۔ انھیں جانے دیجئے ان کی راہ کھوٹی نہ کیجئے۔ آپ کی خفگی کا حال معلوم ہو گا تو میری قسم کی پرواہ نہیں کریں گے۔ انھیں ہر حال میں جا کے بڑی ڈگری لانا ہے۔"

شہیر مجبور تھا۔ اسے زبردستی زوبی نے بھجوا دیا۔ اور طوعاً و کرہاً وہ ڈھائی سال کے لئے جرمنی چلا گیا۔

امیر احمد کے خط برابر آتے تھے۔ انھیں اماں کا سخت صدمہ ہوا تھا۔ ابھی ان کے آنے کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ انھوں نے اماں کو بھجوانے والی رقم زوبی کی طرف منتقل کر دی۔ ہر ماہ کے ایک ہزار

زوبی کے لئے بہت بڑا سہارا تھے۔ شہر کی کامیابی سے امیر احمد بے حد خوش ہوئے تھے۔ حالانکہ زوبی نے شائستہ کو منع کیا تھا۔ کہ امیر احمد کو اس کی تباہی کی داستان نہ سنائی جائے۔ مگر شائستہ کی دانست میں امیر احمد کو لاعلم رکھنا مناسب نہ تھا۔ انھوں نے انھیں لکھ دیا تھا۔ کہ افتخار نے ایک بہتان رکھ کر زوبی کو گھر بھجوا دیا تھا۔ بے چارے امیر احمد زوبی کی تباہی اور اماں کی موت سے بہت دلگیر تھے۔ مگر ساتھ ہی مجبور بھی اتنے تھے۔ انھوں نے خود بھی ایک تفصیلی خط افتخار احمد کو لکھا تھا۔ انھیں بھی افتخار نے جواب نہیں دیا۔

زوبی نے ایک تعلیمی سنٹر جوائن کر لیا تھا۔ تعلیم بالغان کا ادارہ تھا۔ وہاں اس کا بہت جی لگتا تھا اور وہاں کی ساری خواتین میں سب سے کم عمر بھی زوبی ہی تھی۔ اس کی تو عجیب غائب ماہیت ہوئی تھی۔ اب نہ وہ لڑکپن تھا۔ نہ وہ غیر سنجیدگی۔ اب وہ نہایت استقلال سے زندگی کو بھگت رہی تھی۔

گھر آنے کے کچھ ہفتوں کے بعد زوبی نے ایک بچّی کو جنم دیا۔! اور اس دن اسے بے وفا بے مہر سنگ دل شوہر کی یاد نے بہت رلایا۔ حویلی میں پیدا ہونے والی بچّی ایک نرسنگ ہوم میں پیدا ہوئی تھی۔ شائستہ نے بھی افتخار کو خوب کوسا اور بددعائیں دی تھیں۔

"ان کا کیا بگڑ گیا باجی۔" زوبی بولی۔ "ان کی شادی سفینہ سے ہو جائے گی۔ ان کے اور بچّے ہوں گے۔ اس غریب بچّی کی انھیں کیا پروا۔"

"اس نابکار کو اس خوشخبری کی اطلاع تو دیئے دیتا ہوں۔ شاید خبیث کا دل پسیجے" رضا نے کہا۔ انھوں نے ملامت آمیز خط کے ساتھ بچی کی پیدائش کی خبر افتخار کو دے دی۔ زوبی کی تنہائی اور بربادی نے سبب ملول و دل گرفتہ رہتے تھے۔ اور اس کی خاطر افتخار کی ساری زیادتی معاف کرنے پر آمادہ تھے۔ زوبی کی عمر اکیلے رہنے کی نہ تھی۔ لیکن باپ بن جانے کی خبر نے بھی افتخار کو متاثر نہیں کیا۔

نرسنگ ہوم سے آنے کے بعد بچی اس نے بوڑھی بوا جی کے سپرد کر دی۔ وہ تجربہ کار تھیں۔ بچی کو اچھی طرح سے رکھ سکتی تھیں۔ زوبی بچہ سنٹر جانے لگی۔ تعلیم سے اسے اب دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ بچی جانے سے پڑھنے میں جٹ گئی تھی۔ اور اسے احساس ہوا تھا کہ رشیدہ کا کہا سچ تھا۔ وہ ذہین تھی۔ پڑھ سکتی تھی۔ لیکن اس نے پڑھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔

دن یکساں رفتار سے گزرے جا رہے تھے۔ لیکن ایک غیر متوقع حادثہ نے زوبی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ بچہ سنٹر کی خواتین کا کھانا تھی۔ اکثر زوبی اسے لے آتی۔ اور گھنٹہ بھر بعد بڑی بی آ کے اسے لے جاتیں۔ بچی دو ماہ کی تھی۔ بے حد پیاری سی۔ ماں کے حسین خط و خال اور باپ کا ساوقار اس کے چہرے کو بے حد پرکشش بنا دیتا تھا۔ بچی تو زوبی کی زندگی اس کی جان تھی۔ وہ اس سے جدا ہو گئی۔ ایک روز حسب معمول بڑی بی دن کے گیارہ بجے سنٹر پہونچیں۔ اور بولیں۔

"بیٹی! تم بچّی کو لے آئی ہو ساتھ ہیں۔ دودھ کی بوتل بھی لے آیا کرو۔ مجھے تو انس کے بعد کے رہنے سے بیقراری ہوتی ہے۔ لاؤ مجھے دے دو۔ گھر لے جا کے دودھ پلا دوں۔ سلا دوں آرام سے۔"
"یہ کیا کہہ رہی ہو بوا جی" زوبی سخت متوحش ہو کر بولی۔ "میں تو بچی کو دالان میں سلا آئی تھی۔ اسے یہاں نہیں لائی۔ تم نے ابھی طرح دیکھا پلنگ سے نیچے نہ گر پڑی ہو۔"
بوا جی سرد ہو گئیں۔ "بچی پلنگ پر نہیں ہے۔ کہاں گئی۔ ہے پروردگار۔" حواس باختہ ہو کر وہ الٹے پیروں گھر بھاگیں۔ ان کے ساتھ سنٹر کی خواتین اور استانیاں بھی بھاگیں۔ گھر کھلا پڑا تھا۔ بچی کے ننھے منے رنگ برنگی خوشنما کپڑے صحن میں الگنی پر پڑے سوکھ رہے تھے۔ اس کا ننھا منا جھنجھنا زمین پر پڑا تھا۔ مگر پلنگ پر بچی نہ تھی۔ اس کی دودھ کی شیشی بھی غائب تھی۔
"کہاں گئی میری بچّی"؟ دیوانوں کی طرح زوبی سارے گھر میں بھاگتی پھر رہی تھی۔ "میری بچّی کو کون لے گیا۔ ہائے میری بچّی —!"
وہ بیہوش ہو کر گر گئی۔
سب کے حواس گم تھے۔ بوا جی دھاڑیں مار رہی تھیں۔ زوبی ہوش میں آئی اور سر زمین پر پٹخنے لگی۔ استانیاں اور خواتین بھی بادیدۂ پرنم دیکھ رہی تھیں۔ ان کے بنائے کچھ نہ بن رہا تھا۔ رضا اور شائستہ کو اطلاع دی گئی۔ اور دوڑے آئے ساتھ میں پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ اور پولیس والوں کو بھی لیتے آئے۔ ادھر ادھر شدید دوڑ دھوپ ہوئی۔ رضا نے اپنی ہر امکانی کوشش کی۔ پولیس

نے بھی وعدہ کیا کہ چپہ چپہ پران کے لوگ پھیل جائیں گے۔ اسٹیشن پر نگرانی کرائی جائے گی ـــــ انھوں نے بچی کی تصویر مانگی۔ مگر تصویر کوئی نہیں تھی۔ بہر حال شہر کے ہر اخبار میں اشتہار دیا گیا کہ بچی کی بازیابی پر لانے والے کو دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ سب تن بہ تقدیر ہو بیٹھے۔

"ہو نہ ہو۔ وہی شیطان لے گیا ہے۔" شائستہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے کب گھر میں گھس آیا اور بچی کو لے گیا۔"

"اسے خبر بھی نہیں۔" بوا جی کی حالت تباہ تھی۔ "اس نے ان چھ سات مہینوں بیٹا ہی کی خیر خبر نہ لی۔ بچی کو کیا لے جاتا۔ یہ کسی اور موت کھانے کا کام ہے۔"

"آج کل ایسے کتنے واقعات سننے میں آرہے ہیں۔" رضا نے آہ بھر کر کہا۔ "میٹرنیٹی ہوم سے اسپتالوں سے حتیٰ کہ گھروں میں جھولوں میں سوئے ہوئے بچوں کو بھی بدمعاش اغوا کر رہے ہیں۔ ان کا پتہ تو بہر حال چلتا ہی ہے۔ مگر بہت دنوں بعد۔"

"تو میری بچی کیا اب نہیں ملے گی۔ دولہا بھائی۔" زوبی کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ سر ٹکراتے ٹکراتے پیشانی سرخ اور متورم ہو رہی تھی۔ اس پر سکرات کا سا عالم طاری تھا۔ کبھی وہ روتی کبھی سانسیں لیتی کبھی آوازیں دیتی۔ کبھی اس پر غصے کا حملہ ہوتا۔ دیوانوں کی سی کیفیت ہو رہی تھی۔ رہ رہ کر اس کی نظریں صحن میں بندھی الگنی پر پڑتیں جس پر ننھے منے پاجامے خوبصورت فراکیں، رنگین موزے پڑے ہوا سے یوں ہل رہے تھے۔ جیسے اپنے پہننے والے کو شرارت

سے اشارے کر رہے ہوں۔ اس کے ساتھ کھیل رہے ہوں۔!

زوبی ان کپڑوں کو سمیٹ لائی اور اپنے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ کہتی جاتی تھی "اب تو نہیں ملے گی۔ میری نینا اب تو جدا ہو گئی مجھ سے۔ کہاں ہے میری بچی کس نے میری گود اجاڑ دی۔ کس نے میرے سینے سے میرا دل نوچ لیا ہے۔ میری بچی تو کہاں ہے۔ چلی آ۔ میری بیٹی۔ میں تیرا منہ چوم لوں۔ تجھے چھاتی سے لگاؤں کون ظالم تجھے لے گیا۔ میری نینا۔ تو کیسے رہے گی ماں کے بغیر۔ کس کے سینے سے لگ کر سوئے گی۔ تجھے دودھ کون پلائے گا۔ ہائے جب تو ننھے ننھے ہونٹ سکوڑ کر روئے گی تب۔ تب کون تیرا منہ چومے گا۔ نینا۔ میری بچی آ۔ آجا۔ اپنی ماں کے پاس۔" زوبی کا بلکنا کسی سے دیکھا نہ جا رہا تھا۔ وہ سب اس کے ساتھ رو رہے تھے۔ رضا تک رونے لگے تھے۔ سب کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ شاید وہ ظالم بچی کو لے آئے۔ جو لے گیا تھا۔ شاید اس کے دل میں خدا رحم ڈال دے۔ شاید۔ دو ماہ کی نینا کسی معجزے کے تحت خود ہی بھاگتی ہوئی آئے۔ اور ماں کے کلیجے سے لگ جائے۔ دروازہ کھلا رہا وقفہ وقفہ سے کوئی پولیس مین آ کے کہہ جاتا کہ شہر بھر کے اسٹیشنوں پر ان کے آدمی متعین ہیں۔ سارے اسپتال چھان ڈالے گئے ہیں لیکن کہیں بچی کا پتہ نہ تھا۔

جیسے جیسے دن ڈوب رہا تھا۔ سب کی امیدیں بھی دم توڑ رہی تھیں۔

"نجانے کون لے گیا کہاں ہو گی بچی ہے" رضا نے بہت چپکے سے

شائستہ سے کہا۔ "مجھے یہ کارستانی صرف اسی صورت حرام بدمعاش کی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کی خبریں کسی ذریعہ سے پہونچتی ہوں گی کہ امیر ترقی کر کے امریکہ چلے گئے۔ شبیر جرمنی جا پہونچا۔ اور زوبی بھی ہر فکر و غم سے آزاد سنبڑ آ جا رہی ہے۔ اسے توقع تھی کہ ہم میں سے کوئی وہاں جا کے بدمعاش کے پاؤں پڑے گا۔ روئے گا۔ گڑ گڑائے گا۔ اس کی توقع پوری نہیں ہوئی بس۔" نہایت زبردست پسینہ خیز گالی دے کر رضا نے بات مکمل کی۔ "جل مرا ہے۔ انتقاماً بچی کسی بدمعاش سے اٹھوا منگوائی ہے۔ میں شام کی گاڑی سے نظام آباد جاؤں گا۔ اگر مجھے پتہ چل گیا کہ اسی کی حرکت ہے تو خدا کی قسم معاف نہیں کروں گا۔ اتنا برا حشر کروں گا کہ مرتے دم تک یاد رکھے گا۔ کہ اس کا بھی دوست تھا۔ پاجی بدمعاش کو گردن سے پکڑ کر زوبی کے قدموں پر نہ جھکا دوں تو۔ اپنے باپ کی اولاد نہیں شائستہ میری واپسی تک تم اسی گھر میں رہو۔"

"مت جایئے دولہا بھائی۔" زوبی نے ان کے پاؤں پکڑ لئے۔ "کہیں ان کے ملازم آپ کو کوئی نقصان نہ پہونچا دیں۔"

"پہونچائیں گے نقصان مجھے۔" رضا نے برافروختہ ہو کر جواب دیا "میں نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ معلوم ہو جائے کہ اس ظالمانہ حرکت میں اسی کا ہاتھ ہے۔ تو بخدا اس طرح تخ بیخ کر مار دوں گا۔ کہ مردود کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ کیوں بھئی۔ رہو گی تم یہاں۔ یا زبیدہ کو اپنے ساتھ گھر لے جاؤ۔"

"دولہا بھائی ہم یہیں رہوں گی۔" زبیدہ نے کہا۔ "کیا معلوم کب

تھی۔ صاف بے غبار آسمان پر تارے جھلکنے لگے تھے۔ لیکن اس گھر میں تاریکی کے ڈیرے لگے تھے۔ کسی نے کہیں روشنی نہ کی۔ جب دلوں میں مایوسیوں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا تو باہر ہزار آفتاب چمکتے۔ لاکھ چراغاں ہوتا۔ سب بیکار تھا۔ رہ رہ کے زوبی کے سینے سے ہوک اٹھتی۔ اور آہ بن کر ہونٹوں سے نکلتی۔

"باجی کل اس وقت وہ میری گود میں لیٹی ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی آج نہیں ہے۔ آج میری گود خالی ہے۔ صبح کو بھوک سے چلا رہی تھی بستر کو بھگو دیا تھا۔ میں نے کپڑے بدلے تھے۔ دودھ پلایا تھا مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔ آہ۔ مجھے پہچاننے لگی تھی۔ روتے روتے مجھے دیکھتی تو چپ ہو جاتی تھی۔ اب کہاں ہے۔ رو رہی ہو گی۔ کون بہلائے گا۔ کون چمکارے گا۔ کسے احساس ہو گا کہ اسے دودھ پلا دے۔ یا اللہ یہ کیسی سزا مجھے ملی ہے۔ کن گناہوں کی سزا ہے میرے پروردگار۔ الٰہی یا تو میری بچی مجھے واپس کر دے، یا مجھے موت دے دے۔"

باجی کا حال خود بھی تباہ تھا۔ انھوں نے تسلی دی۔ "رضا میاں کچھ نہ کچھ کر ہی کے آئیں گے بیٹا۔ یوں حوصلہ نہ ہارو۔ پولیس والے ہی منی کو ڈھونڈھ لائیں گے۔ تم دل کو سنبھالو بی بی۔"

پھر اداس شام سے رات ہوئی۔ پل پل رات کے لمحے کٹے۔ صبح ہوئی سوگوار سی۔ روز صبح ہوتی تھی نیتا کی قلقاریوں سے ... آج گورستان میں سورج طلوع ہوا۔ نہ کہیں آہٹ۔ نہ آواز۔ سب ایک جگہ ساری رات سے جاگے بیٹھے تھے۔ چہروں پر کرب منجمد۔ لب

سو کھے ہوئے امید کے سہارے جیتے مرتے ہوئے۔ آس کم نراشا زیادہ۔ رضا کی واپسی کا انتظار قیامت بن گیا تھا۔ یہ ایک طویل دن۔ طویل رات سب نے سولی پر گزاری تھی۔ دوسری شام رضا واپس آ گئے۔ مگر خالی ہاتھ شکست خوردہ۔ ٹوٹے بکھرے ہوئے۔ اداسی ان کے چہرے پر نقاب کی طرح منڈھی ہوئی تھی۔

میری بچی ملی ؟" زوبی ان سے لپٹ گئی۔ "ہائے ناکام واپس آئے آپ" اس کی آنکھوں سے پھر ساون بھادوں برسنے لگے۔

کیا ہوا ؟" شائستہ نے گلو گیر آواز میں پوچھا۔

وہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی" رضا نے بھاری لہجہ سنبھال کر جواب دیا۔ "خان بہادر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ بیگم صاحبہ کے کینسر کا آپریشن ہوا تھا۔ وہ ہسپتال میں تھیں۔ اور ــــ"

"بچی" کا کیا ہوا میری بچی نہیں تھی وہاں ؟" زوبیدہ نے زار و قطار روتے ہوئے پوچھا۔ اور نیم بیہوش سی سسکتی ہوئی۔ رضا کے سینے پر سر رکھ دیا۔ رضا نے اسے خود سے چمٹا لیا۔ اور گلو گرفتہ لہجے میں بولے۔ "چار مہینے پہلے افتخار کی شادی اس کی خالہ زاد بہن سفینہ سے ہو گئی۔ وہ مجھے نہیں ملا۔ شیخ صاحب کہہ رہے تھے کہ دو ماہ سے نینی تال میں ہے۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ بچی کو وہ نہیں لے گیا۔ یہ کسی پیشہ ور چور کا کام ہے۔ جو بچوں کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ بس اب اللہ ہی سے مدد مانگو"

زوبی بیہوش ہو کے گر گئی۔

صحیح معنوں میں زندگی کا لطف اٹھانا، کو نہ فولی کے جانے کے بعد ملا تھا۔ ایک دوگونہ عذاب تھا جس میں اس کی جان پڑی تھی۔ زوبی جلی گئی اور اب اس کے گھر والوں کو اس کے ذہنی و جسمانی سکون کی فکر ہوئی۔ انھیں سکون کو مول لینے کیلئے کہیں جانا تھوڑی تھا۔ بیگم صاحبہ اطہر النساء اور سلطانہ بیگم نے ایک بار پھر سفینہ کے والدین کی چوکھٹ پر سر رکھ دیا۔ سفینہ کے والد صوبے دار صاحب اور ان کی بیوی ان لوگوں سے یکسر قطع تعلق کر چکے تھے بیگم صاحبہ سے بولے۔

"آپ کو بے شک اپنے بیٹے کی بھلائی کی فکر ہے۔ اس کا گھر بسانا چاہتی ہیں۔ اس مقصد سے لئے کسی دوسری لڑکی کی تلاش کیجئے۔ نہیں آپ نے سمجھا کیا ہے۔ کچھ آپ کے دبیل ہیں۔ آپ نے عرصے کی لگی بندھی رسم صاحبزادے کی طفلانہ خواہش پر توڑ دی۔ پھر ان کا دل بہلا کر ایک کھلونا توڑنے کے لئے اور حاصل کریں لہذا پھر اسی راستے پر دوڑ پڑیں۔ میری لڑکی اتنی گری پڑی نہیں کہ ایک سکنڈ ہینڈ شخص سے بیاہی جائے میں معافی چاہتا ہوں۔"

"بھائی صاحب آپ کی ناراضی بجا۔" خان بہادر صاحب نے کہا۔ "لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ اس سارے قضیئہ نامرضیہ میں ہمارا قصور کیا ہے۔"

"جس کا قصور ہے۔ لڑکی اسی کے لئے تو مانگ رہی ہیں آپ!" سفینہ کی امی نے کہا۔ "اور اب ہم دینا نہیں چاہتے۔ ہماری بڑی توہین ہوئی ہے۔ سارے میں لڑکی کی بدنامی ہوئی

"بہن بات مان لو۔ ہم دونوں تم سے معافی مانگتے ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کی ناسمجھی سے لگی بندھی عزیزداری اور رشتے نہ توڑو" خاں بہادر صاحب نے کہا تھا۔ لیکن کسی صورت سے وہ لوگ راضی نہ ہوئے خاں بہادر صاحب ان کا کنبہ بے نیل و مرام واپس آیا۔ ان دنوں افتخار بہت ڈسٹرب رہنے لگے تھے۔ ان کا کہیں جی نہ لگتا نہ گھر میں نہ زمینوں پر۔ شادی ناکام رہی۔ تعلیم ادھوری رہ گئی بیگم صاحبہ ایک بار پھر ان کے گھر کی بازآبادکاری کی فکر میں تھیں۔ پھر شادیوں اور پیغام رسانوں کی دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ اس کی خبر صوبے دار صاحب کو لگی۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ انکار تو بے شک کر دیا تھا۔ لیکن جانتے تھے کہ ان کی بیٹی کے لئے افتخار کا سا مالدار شوہر پھر نہیں مل سکتا۔ ان کا اپنا حصہ بھی جائداد میں لاکھوں سے اوپر تھا۔ سفینہ کی خاطر انھیں جھکنا پڑا۔ اور پھر انہی دنوں فکروں کے بوجھ نے خاں بہادر صاحب کو بیمار ڈال دیا۔ ان کا مرض جب بڑھ گیا تو صوبے دار اسی کو بہانہ بنا کر عیادت کے لئے آئے۔ باتوں باتوں میں اپنی سخت گیری اور زیادتی کی معافی مانگی۔ سفینہ کا رشتہ پھر سے استوار ہو گیا۔ زوبی سے شادی سے پہلے افتخار کو وہ پسند تھی۔ ان کی پسند پھر تازہ ہو گئی۔ اور سفینہ انھیں ساحل مراد پر پہنچانے کی ذریعہ بن گئی۔

خاں بہادر صاحب ستر سال سے اوپر ہو رہے تھے۔ بیمار بھی تھے۔ افتخار کی شادی کے ہفتہ بھر بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مہرالنساء اور سلمانہ نے سرگوشیاں شروع کر دیں۔" پہلی والی بدچلن

تھا۔ دوسری منحوس نکلی۔ ابھی ہاتھوں کی مہندی بھی پھیکی نہ پڑی تھی کہ ابّا جان کو ڈکار گئی۔ ہائے ہائے ہارٹ کے مریض تھے ابا جان سال بھر بستر پر پڑے رہتے تو نہ کھلتے۔ ایک مہینہ میں چٹ پٹ ہو گئے۔

ہاں ادھر اس رشتے کی تجارباز کے لئے گئے اسی روز سے بیماری کا آغاز ہو گیا۔" سلمانہ نے کہا۔ "مطلب صاف ہے کہ دیورانی جی کا پیر مبارک نہیں۔ امّی جان کا سہاگ اجاڑ دیا۔ اب دیکھو کسے اور اجاڑیں گی۔ افتخار بھی عجیب قسمت لایا ہے۔ افسوس!"
سفینہ کے کان میں اس قسم کی نامناسب باتوں کی بھنک پڑتی تھی لیکن وہ سمجھدار، تعلیم یافتہ اور بے زبان تھی کسی سے کچھ کہتی سنتی نہ تھی بس چپکے چپکے آنسو بہا کے رہ جاتی۔ اس نے افتخار سے بھی کسی کی شکایت نہ کی۔

مہر النساء نے یہ منتر کچھ اس طرح پھونکا کہ بیگم صاحبہ بھی سفینہ کی نحوست کی قائل ہو گئیں۔ انھیں دنوں نواب شریفن کا ہنستا کھیلتا دس برس کا پوتا صرف دو دن کے بخار میں چل بسا سفینہ کی نحوست پر مہر لگ گئی۔ اس کے سائے سے بھی گھر والے خائف رہنے لگے۔ شاید وہ اپنی تقدیر ہی خراب لائی تھی ایک دن گھر کی پالتو بلی کوئی زہریلی چیز کہیں سے کھا کے آئی اور حویلی کے صحن میں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ اس کے بعد ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ دل کی بات زبانوں پر آ گئی۔
بیگم صاحبہ جو شوہر کی یاد میں ہمیشہ گریہ و زاری فرمایا کرتی تھیں

ان کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ بس مہرالنساء نے علانیہ کہنا شروع کر دیا۔

"ہائے گھر کے لوگ نوکر چاکر جانور سب ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں۔ ابّا جان گئے صبر کیا کہ ضعیف تھے۔ بیمار تھے۔ مگر بے چارے کریم کو کیا ہوا تھا۔ ارے بخار کسے نہیں آتا۔ کیا سبھی مر جاتے ہیں۔ غضب ہے کہ بلّی جو ابھی خاصی ادھر سے دلہن کے کمرے سے ہو کر آئی وہ پل بھر میں مر گئی"۔ مجھے تو ہول آ رہا ہے۔ حویلی پر کس منحوس کا سایہ ہو رہا ہے۔ موت یہی در پکڑ کے کیوں بیٹھ گئی ہے۔ اب کسے لے جائے گی۔ میں تو بچّوں کو لے کر سسرال چلی جاؤں گی۔ اللہ میرے بچّوں کی جان کی سلامتی دے۔"

سلمانہ جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہمی تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر کو رگیدنا شروع کر دیا۔

"یہ سب سفینہ کے قدم سے ہو رہا ہے۔ وہ منحوس چھلپیری ہے۔ آدمی جانور سب کو کھا رہی ہے۔ میرا تو منھ نہیں اٹھتا۔ آپ افتخار سے کہئے۔ اسے یا تو طلاق دے یا کہیں اور جا کے رہے۔ اس طرح تو سب کا صفایا ہو جائے گا۔ آخر ہم بھی انسان ہیں۔ بن آئی موت مرنا نہیں چاہتے۔ دل کو خوف لگا رہے تو کیا زندگی کا مزہ۔؟"

بیکار باتیں مت کرو۔" انتصار احمد نے ڈانٹ دیا۔ "کوئی کسی کے سبز یا برے قدم ہونے سے نہیں مرتا جس کی آتی ہے چلا جاتا ہے۔ میں افتخار سے ایسی مہمل بے معنی بات نہیں کہہ سکتا۔ سمجھیں

انسانیت بھی ہے۔ کہ پہلی کو بدکردار سمجھ کے نکالا۔ دوسری کو منحوس سمجھ کے طلاق دلوادیں۔ اس کے بعد تیسری آئے گی وہ بھی کچھ ایسی ہی ہوئی تو پھر۔ کیا تم پھر انتظار شادیاں کرتا اور طلاقیں دیتا رہے گا۔"

"امی جان کی حالت آپ دیکھ رہے ہیں۔ چار پائی سے لگ کر رہ گئی ہیں۔ ایسی صحت مند اتنی چاق چوبند تھیں۔ انھیں آخر یکبارگی کیا ہوا ہے۔" سلمان نے کہا۔

"امی جان کے جگر پر کینسر ہے۔ معلوم ہے تمھیں۔" انتصار احمد نے بے حد درشت اور برہم لہجے میں کہا۔ "یہ بات میں کسی سے کہنا نہیں چاہتا تھا تم سے کہنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے ان کا مکمل معاینہ کیا تھا۔ اور ایک جواب سنا دیا تھا۔ کہ اس صورت حال میں آپریشن بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جتنے سانس ان کے مقدر نے اور رکھے ہیں۔ وہ سب سے درمیان پورے کریں۔"

سلمان نے کلیجہ تھام لیا۔ "پھر اب کیا ہو گا۔"

"آپریشن کا رسک نہیں لے سکتے۔ پھر جو اللہ کی مرضی! یہ کینسر مہینوں پرانا ہے۔ اب تک چھوٹا تھا۔ تکلیف نہیں دیتا تھا۔ اب اس کا حجم بڑھ گیا ہے۔ تکلیف دے رہا ہے۔ اس لئے نہ کہنا کہ یہ بھی کسی کی سبز قدمی کی نحوست ہے۔" انتصار احمد ان کی سننے پر تیار نہ تھے۔

سفینہ سب کچھ سن رہی تھی دیکھ رہی تھی۔ لیکن کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ ان حالات کا مقابلہ کیا کرتی۔ جو اس کے قابو کے نہ تھے۔

اس نے افتخار سے بھی کچھ نہیں کہا۔ بس دل ہی دل میں کڑھتی رہی لیکن افتخار ہی نے سن گن لے لی۔ اور بہت بگڑے۔

"اگر سفینہ اپنے ساتھ بیماریاں اور موت لائی ہے تو بس ہمیں اجازت دیجئے۔ ہم اس گھر سے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے آپ لوگ کیوں مریں۔ سفینہ کو خدا نے مارنے جلانے کا ٹھیکہ دیا ہے نا؟ ساری خلقت اس کی وجہ سے مرے گی۔ آپ لوگ تو قیامت کے نور بیٹے سمیٹنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اب سفینہ کے گھر سے چلے جانے کے بعد کوئی مرے گا تھوڑا ہی۔"

"سامنے کی بات ہے پہلے سب کیسے ٹھنڈے سیلے رہتے تھے۔" مہر النساء نے کہا۔ اب تو گھر پر مجھے موت ہی کے سائے مسلط دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ زندوں کی خبر کرے۔ میرے دل میں تو وہم بیٹھ گیا ہے۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے!" افتخار دہاڑنے لگے۔ "ہم چلے جاتے ہیں۔ ابا جان کے بعد خود میرا دل بھی اس منحوس حویلی سے بھر گیا ہے۔ اور آپ سب کا جی ہم سے بھر گیا ہے۔ لہٰذا ہمارا اس جگہ کو خیر باد کہنا ہی بہتر ہے۔"

"افتخار پاگل پن کی بکواس مت کرو۔" انتصار احمد نے کہا "عورتوں کی ناقص العقلی پر گھر چھوڑ نا تمہاری سمجھداری سے بعید ہے۔ جو مر گیا وہ رضائے الٰہی سے مرا۔ جسے موت آئے گی وہ بھی خدا کی مرضی سے آئے گی۔ گھر مت چھوڑنا۔ خبردار——"

"بھائی جان آپ سفینہ کی حالت نہیں دیکھتے! اس قسم کی دلشکن

باتیں سن سن کر اس کی صحت برباد ہو رہی ہے۔ روتے روتے سر میں مستقل درد پیدا کر لیا ہے۔ اگر اس کے والدین یہ باتیں۔۔ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟" افتخار نے فریاد کی۔ "بہتر یہی ہے کہ اس سے قبل کہ میں یا سفینہ کو موت آئے ہمیں اجازت دیجیئے!"

"خاموش رہو!"

بیگم صاحبہ کا آپریشن ہوا تھا۔ اور وہ اسپتال میں پڑی تھیں انتصار احمد سے معالجین نے کہہ دیا تھا۔ کہ یہ صرف دل کی تسلی تھی۔ ورنہ بیگم صاحبہ کا مرض بہت بڑھ چکا تھا۔ آپریشن سے کچھ فائدہ نہیں۔ وہ موت و حیات کی روح فرسا و جانگسل کشمکش میں گرفتار رہی تھیں۔ کہ ایک اچانک حادثے نے سفینہ کو بھی اپنی نحوست کا یقین دلا دیا۔ زینے سے اترتے ہوئے بالکل غیر متوقع طور پر اس کا پاؤں پھسل گیا اور اس طرح پھسلا کہ وہ دس بارہ زینوں پر سے نیچے گری۔ اسے تین ماہ کا حمل تھا۔ وہ ضائع ہو گیا۔ دس دن نرسنگ ہوم میں رہی۔ مگر اس کے والدین کے سوا حویلی کا کوئی فرد اس سے ملنے نہیں گیا۔ افتخار البتہ پاس پاس رہے۔ انھوں نے بتایا کہ زینوں کو صبح ہی کنیز چمبیلی نے دھویا تھا۔ ان پر کیلے یا سنگترے کا چھلکا یا چکنا پتھر کنکر کچھ بھی تو نہ تھا۔ کہ ان پر سے سفینہ پھسل جاتی۔ سفینہ کے آنسو بہت دنوں تک نہ تھمے۔ دل زخمی تھا۔ ان کے سسرال والے گریز کرتے تھے۔ افتخار کی محبت نصیب نہ ہوتی۔ تو کچھ کھا کر سو رہتی۔

انتصار احمد نے سختی سے افتخار کو روک لیا تھا لیکن پھر

افتخار کو بدرجہ مجبوری حویلی سے نکلنا ہی پڑا۔ اس کی وجہ ثمر بنی تھی
زوبی کا کانٹا بیچ سے نکل چکا تھا۔ اس کے بعد ثمر اور ناصر
کا ڈھکا چھپا رہا ا رومان خوب پھلا پھولا۔ دونوں حویلی سے
باہر ملتے۔ سیر سپاٹے کرتے پھرتے۔ ناصر کی خوبصورتی اور آواز پر
ثمر فدا تھی۔ اور ناصر اس کے ذریعے دولت بٹور رہا تھا۔ یہ رومان
عرصے تک نہ چل سکا۔ ایک شام دونوں اسکوٹر پر کسی پکنک
اسپاٹ سے واپس آرہے تھے۔ محبت کے نشے میں بدمست
ناصر گاڑی تیز بھگا رہا تھا۔ نتیجتہً اس کی ٹکر ایک جیپ کار سے
ہو گئی۔ وہ بھی تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑ رہی تھی۔ انجام بہت
بھیانک ہوا۔ جیپ نے اسکوٹر کو اچھال پھینکا۔ ناصر بر سر
موقعہ ہلاک ہو گیا۔ ثمر بھی دور جا پڑی تھی۔ وہ زندہ تو بچ گئی
مگر ایک ٹانگ سے ہمیشہ کیلئے معذور ہو گئی۔ حویلی میں اس
حادثے نے کہرام برپا کر دیا۔

حادثوں پر حادثے۔ سفینہ مکمل طور پر سبز قدم مان لی گئی۔
کسی نے سوچا تک نہیں کہ یہ کس ستم رسیدہ مظلوم کی آہوں کا
وبال پڑ رہا تھا۔ اور جلد یا بدیر افتخار بھی اس کی زد میں آنے
والے تھے۔

سفینہ ہر طرف کی یورش سے حواس باختہ ہو کر پھوٹ پڑی۔
"نہیں رہنا ہے یہاں مجھے۔ لے چلئے مجھے کہیں اور۔ سچ مچ
میں منحوس ہوں۔ میری وجہ سے آپ کے گھر پر تباہیاں آرہی
ہیں۔ مجھے آزاد کر دیجئے۔ میں اپنی امی کے پاس چلی جاؤں گی۔"

ضرور جاؤ ہم تو تمہاری صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے!"
مہرالنساء غم کے مارے نیم جان تھیں۔ جوان لڑکی کا عمر بھر لنگڑی ہو جانے کا خیال بڑا بھیانک تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سفینہ کو طعنے دیا کرتی۔

"جس دن سے تمہارا ذکر اس گھر میں ہوا ہے۔ آفتیں نازل ہونے لگیں ہیں۔ ابّا جان مر گئے۔ امی جان کا حال یہ ہے۔ گھر کے ملازم، پالتو جانور مر گئے۔ میری بچی تمام عمر کے لئے معذور اپاہج ہو کے رہ گئی۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ ہماری خوش بختی کی قسم کھائی جاتی تھی۔ اب ہم سا بدنصیب اور پریشان بھی کوئی نہیں۔ یہ مصائب یہ موتیں تمہاری وجہ سے نازل ہو رہی ہیں۔ تم سبز قدم ہو۔ منحوس ہو۔ نکل جاؤ حویلی سے۔ اپنی بچی کو دیکھ دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ یہ نامراد حویلی میں دندنا رہی ہے۔ اور وہ جوان جہان بچی معذور بستر پر پڑی ہے۔ ارے تجھے خدا غارت کرے نشانی۔ مر جائے تو۔"

"بس باجی بہت ہو گیا۔" افتخار نے کہا۔ آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ "اب ہم جاتے ہیں۔ قسم کھاتا ہوں مرحوم باپ کی جیتے جی آپ کی صورت نہ دیکھوں گا۔ میں مر چکا آپ کے لئے۔ آپ سب مر چکے میرے حق میں۔ خدا آپ سب کو غارت کرے۔ نہ اس بھلی دانی کے ساتھ مجھے سکھ سے رہنے دیا۔ نہ اس کے ساتھ رہتے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔"

بھائی بہن میں خوب جنگ ہوئی۔ انجام کار افتخار نے اپنا

سامان اکٹھا کر دیا۔ اور حویلی کو خیرباد کہہ دیا۔ اقتدار احمد نے بھی کچھ نہ کہا۔ اب افتخار احمد کو روکنے سے بھی وہ معذور تھے۔ انھوں نے ان کے کاغذات ان کے حوالے کر دیے۔ نقد رقم بھی باپ کے ورثہ سے دے دی۔ افتخار ہمیشہ کے لئے گھر سے چلے گئے بیگم صاحبہ ہسپتال ہی میں پڑی زندگی کی خیر منا رہی تھیں۔ موت سے لڑ رہی تھیں۔

حویلی والوں نے سفینہ کے جانے کے بعد سکون کی سانس لی۔ کسی نے ان سے پھر ملنا گوارہ نہ کیا۔

افتخار نے ایک خوبصورت گھر خرید لیا تھا۔ وہ بھی یہاں مطمئن تھے۔ کوئی دل آزاری کرنے والا نہ تھا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ سب کچھ حسب مرضی تھا مگر سفینہ کو ایک چپ لگی تھی۔ نئی باتوں کا رد عمل تھا۔ نامکمل بچے کے ضائع ہونے کا ... ا بہت خاموش رہنے لگی تھی۔ اس کے دکھ کا احساس افتخار کو بھی تھا۔ انھوں نے بہت دلسوزی سے سمجھایا۔

"زندگی میں ایسے معمولی سانحے تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کو اتنی شدت سے محسوس نہ کرو۔ اپنی صحت بڑی قیمتی چیز ہے۔ اس کی قدر کرو۔ اور بھئی بچے وچے کا تو یہ ہے کہ خدا اور دے گا۔ اسے کرم کرتے کچھ دیر لگتی ہے۔ یا تو پھر ——— " وہ دفعتہً کچھ سوچنے لگے۔ چہرہ چمک اٹھا۔ آنکھیں روشن ہو گئیں۔

"یہ تنہائی مجھے ڈستی ہے" سفینہ نے کہا۔ "آپ صبح کے گئے شام کو واپس آتے ہیں۔ دن بھر میں پاگلوں کی طرح اکیلی گھبراتی ہوں۔

ٹکراتی رہتی ہوں۔ سچ مچ ایک دن پاگل ہو کے چیخ پڑوں گی۔

"جانِ من۔ زندگی کی گاڑی کو آرڈر میں رکھنے کے لئے روپے کا پٹرول بہت ضروری ہے۔ یہ آزوقہ جو ساتھ ہے کب تک چلے گا۔" افتخار نے کہا۔ "تم ایک مٹکا پانی کا بھر لو اور روز اس سے نکال نکال کر پیا کرو۔ مٹکا ایک دن خالی ہو جائے گا۔ اور روپیہ تو برف کا تودہ ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ پگھل کے ختم ہو جانے والا۔ لہٰذا! میری ملازمت تو بہت ضروری ہے نا کماؤں گا نہیں تو کھاؤں گا کیا۔ تم تو شکر کرو کہ میرا تعلیمی ریکارڈ دیکھتے ہوئے کالج میں لیکچرر شپ مل گئی۔ کچھ تو سہارا ہو گیا۔ میری مانو تو تم بھی کہیں سروس کر لو۔ جی بھی بہلے گا اور کالج میں سہیلیاں بھی بن جائیں گی۔ اتنی تنہائی نہ رہنے گی۔

"نہیں میرا جی نہیں چاہتا" سفینہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "مجھے اجازت دیجئے تو چھوٹے بھیا سے "بچے" کو لے آؤں۔ اسے پالوں پوسوں۔ بچوں کے بغیر میرا دل ہی نہیں لگتا۔ گھر میں بھی بھائی بہنوں کے بچوں کو میں ہی سنبھالتی تھی۔

"بچہ" ہی چاہئے نا تمہیں۔ تو پھر میں اپنا "بچہ" کیوں نہ لے آؤں" افتخار بڑی بے دردی سے ہنسے "اسے پالو پوسو اس کی پرورش کرو۔ اپنا "بچہ" اور ان کم بختوں کو سزا ملے جنھوں نے ایک بدکردار لڑکی میرے گلے لگا دی تھی۔ سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں کتنا زیادہ بے وقوف بنا تھا۔"

"آپ کا "بچہ" کہاں سے آیا" ایک دوست نے اطلاع دی تھی۔"

افتخار نے کہا۔ "تم اجازت دو تو ان لوگوں سے اپنی بچی لے آؤں۔"
"بھلا آپ کی پہلی بیوی اپنی بچی کیوں دیں گی؟"
"اس کے اچھے اچھوں سے چھین لاؤں گا۔" افتخار نے اکڑ کر کہا۔ "کسی کے دینے دلانے یا کسی سے اجازت لینے کا سوال کیا۔ میری بچی ہے۔ اس کی نہیں۔"
"نہیں نہیں کسی ماں کا دل دکھانا اچھی بات نہیں۔ خدا کو کہیں ناگوار نہ گزرے۔ پہلے ہی مجھ پر نحوست کا ٹھپہ لگا ہے۔ اب کہیں ظالم ڈائن کا لیبل نہ لگ جائے۔" سفینہ نے کہا۔ پھر وہ حسرت سے مسکرائی۔ "اللہ کو اگر منظور ہوا تو مجھے بھی نواز دے گا۔ ورنہ شکوہ نہیں۔ اس کی مرضی۔
"بہت اللہ والی نہ بنو۔" افتخار نے مضحکہ اڑایا۔ "ابھی اس قسم کی باتیں کرنے کی تمہاری عمر نہیں۔ کیا ہوا اگر ایک اتفاقی حادثہ میں تمہارا بچہ جاتا رہا۔ کوئی نقص تو پیدا نہیں ہوا ہے نا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی بچے وچے کا جنجال پالنا بھی نہیں چاہتا۔ ہمارے عیش میں خواہ مخواہ زہر گھولے گا۔ کچھ عرصے ہم مزے کریں گے۔ سیر سپاٹے۔ تفریح۔ گھومنا پھرنا۔ یہی موڈ۔ صحیح معنوں میں میری شادی تو اب ہوئی ہے۔ وہ تو ایک حماقت تھی۔ جلد بازی۔ اچھا ہوا کہ چھٹکارا ہو گیا۔ ورنہ خدا جانے حویلی میں اور کیا گندگی پھیلاتی۔ لاحول ولا قوۃ!"
"اب کیوں بے چاری کی غیبت کیجئے گا۔" سفینہ نے کہا۔
"مجھے اچھا نہیں لگتا۔ معلوم نہیں اس پر کیا گزر رہی ہے۔ شادی کی

رفاقت کے بعد مفارقت بڑی جانگسل ہوتی ہے۔ آپ نے جب منگنی توڑ دی تھی۔ تب میرا کیا حال ہوا تھا۔ آپکو نہیں معلوم۔ حالانکہ میں آپ کے پاس نہیں رہی تھی۔ لیکن آپکو اپنا سب کچھ مان تو لیا تھا۔ اور وہ غریب تو آپ کے پاس کئی مہینے رہی تھیں۔ ان کے محسوسات تو اب بڑے تکلیف دہ ہوں گے۔

"رہنے دو بھئی رنگ میں بھنگ نہ کرو!" بیزار ہی سے افتخار نے کہا۔ "تمہیں اس سے بڑی ہمدردی ہو رہی ہے۔ تم کیا جانو کیسی عجیب لڑکی تھی۔ میں نے تو اس کی سی زبان دراز۔ گستاخ۔ بے ادب اور بدتمیز لڑکی نہیں دیکھی۔ میں ساری برائیوں کو برداشت کرتا رہا لیکن بدچلنی تو... برداشت کرنے والی بات نہیں تھی۔ نکال باہر کیا۔"

"میں نہیں مانتی!" سفینہ نے کہا۔ خدا جانے آپ سب کو کیا غلط فہمی ہوئی تھی۔ ایک جاہل لڑکی کیا جانے عشق و محبت کا چکر۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں کہ اسے آپ سے محبت بھی تھی۔ نہیں! یہ کوئی اور بات ہے۔ مجھی کو آپ کے لوگوں نے خوامخواہ منحوس کا خطاب دے کر حویلی سے نکالنے کا بہانہ بنالیا۔ اسے بھی اسی طرح کسی نہ کسی ٹھیک بہانے سے نکالا ہے۔

"اماں کمال کرتی ہو بھائی" افتخار نے کہا۔ ارے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دلہن بنی بیٹھی اس بدبخت لچر کے سامنے مسکرا رہی تھی۔ اور وہ مردود آنکھوں آنکھوں میں اسے ہضم کئے لیتا تھا۔ کیا میں نہیں جانتا۔ عذاب ثواب۔ سزا جزا۔ وہ تھی جاہل مطلق مگر میں تو نہیں تھا۔

اور مسرور رہنے کی ادا کرتی۔ افتخار اس کی دل جوئی کو اِدھر اُدھر سے یہاں وہاں لئے لئے پھرتے۔ دو تو دو تنہا تھے۔ بچے وچوں کا جھنجھٹ نہ تھا۔ گھومنا پھرنا فلمیں دیکھنا گھر پر دوستوں کی دعوتیں کرنا۔ ہنسی مذاق۔ دکھاوے کا راحت و آرام۔ اندر اندر سفینہ کو دکھ کی دیمک کھوکھلا کر رہی تھی۔ بالآخر افتخار نے بھانپ ہی لیا۔ وہ اس ماحول میں خوش نہ تھی۔ اس نے جانوروں کے بچے پالنے شروع کر دیئے تھے۔ ننھا سا بچہ ہرن کا ننھا مرغی کے چوزے بلی کے بچے۔ ایک خوبصورت سا بچہ کتے کا۔ اپنے اوقات ان حیوانوں پر ضائع کر رہی تھی۔

افتخار کو سفینہ سے محبت بہت زیادہ تھی۔ ان سے بیوی کا دکھ محرومی برداشت نہ ہوئی۔ انھوں نے اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر ایک ایسا نا ممکن قدم اٹھایا۔ جو ان کے سے آدمی کے شایان شان نہ تھا۔

سفینہ احتجاج ہی کرتی رہ گئی۔ مگر وہ افتخار تھے۔ ضدی ہٹ دھرم، من مانی کرنے والے۔ ابھی ان کی امی ہسپتال ہی میں پڑی تھیں وہ سفینہ اور بچی کو لے کر نینی تال چلے گئے۔

حصہ دوم

وقت ـــــــ!

عجیب چیز ہے وقت شام و سحر کی گردشوں میں بٹا ہوا۔ لمحوں میں بٹا ہوا۔ ماہ و سال کا نام لیوا جیسے زمین و آسمان کی آسیہ گردانی وقت کا برادہ کر کے اسے ماضی کے کھنڈروں میں پھینکا ۔ کے لمحے اور ساعتیں حال کے قالب میں ڈھال لیتی ہے۔ تاکہ سورج کے طلوع و غروب کے اعتبار سے ماضی حال اور مستقبل کو تخلیق کر سکے۔ پلک جھپکتے گزر جاتے ہیں سب اچھے برے لمحے۔ جو کبھی کسی کی گرفت میں نہیں آئے وقت دیرپا ہے۔ وقت گریز پا ہے۔ وقت مہربان ہے۔ وقت ظالم ہے۔ عجیب چیز ہے۔

اٹھارہ برس میں اٹھارہ سنگدل برساتیں۔ ایک ہی آتش یاد تازہ کرتی ان پر سے گزری تھیں۔ ان برساتوں کا ایک ایک قطرہ پانی ان کی زخمی روح سے گر کر زمین پر گرا تھا۔ کہیں دل شکن یادیں پھر ان کے ذہن میں نشتر سی چبھوتی تھیں۔ جب کالی گھٹا مست فیل بے زنجیر کی طرح افق مغرب سے ابھرتی اور دیکھتے ہی

دیکھتے دیکھتے سیاہ مہیب شکلیں آسمان کے کینوس پر بننے بگڑنے لگتی تھیں۔ وہ لمحے ان پر بڑے کٹھن گزرتے۔ ان کا بس نہ چلتا کہ وہ موسموں کے الٹ پھیر سے برسات کے موسم کو نکال دیں۔! جاڑے ٹھٹھراتے ہوئے گزریں۔ گرمیاں پگھلاتی ہوئی آئیں انہیں سب منظور تھا۔ برسات کا موسم انہیں بہت دکھ دیتا تھا۔! پانی، آندھی، بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک اور مسلسل رم جھم رم جھم کتنی ناقابل برداشت بات تھی۔

اور اس دن کالی گھٹا پھر جھوم کے اٹھی تھی۔

گہرے بادلوں کے پس منظر میں ہرے ہرے اونچے اونچے درختوں کی قطاریں سحر کن ہو رہی تھیں۔ پھولوں کے تختے تر بتر ہواؤں کے جھونکوں سے مچل مچل جاتے تھے۔ فوارے کے بلوریں موتی حوض کے متلاطم پانی پر برستے اور جلترنگ سا بج اٹھتا۔

پھر ہواؤں کے تیز جھکڑ کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔!

اور اندرا میموریل کالج کی نئی پرنسپل دریچے کا خوشنما پردہ سرکا کر اپنی مخصوص آرام کرسی پر آ بیٹھیں۔ گھنٹی بجا کر ملازمہ کو طلب کیا۔ ادھیڑ عمر کی خادمہ جس کے پر گوشت چہرے سے خلوص اور ایمانداری ظاہر تھی۔ آ کے خاموش کھڑی ہو گئی۔

"کافی نہیں دی آج۔" وہ بے حد نرم انداز میں مسکرائیں۔

"تیار ہی تھی بی بی۔" خادمہ نے کہا۔ "ابھی لئے آتی ہوں۔ ساتھ میں بھی کچھ لاؤں۔ صبح کے بنے سموسے ابھی خستہ ہیں۔ کھانے میں دیر ہے۔ تب تک سہار ہو جائے گی۔

"نہیں بواجی! صرف کافی! اور سنو۔ اگر وہ کل والے صاحب پھر آئیں تو یہ نہ کہنا ان سے کہ میں گھر پر ہوں۔ میں ان سے بار بار ملنا نہیں چاہتی۔"

"جی اچھا!"

کچھ دیر بعد خادمہ کافی پہونچا گئی اور یہ خبر بھی سنادی کہ پھر وہ کل والے صاحب آئے تھے۔ انھیں چلتا کر دیا۔ یہ وہ دروازے کا بھاری پردہ برابر کر کے بے آواز چلی گئی۔

اندرا میموریل کالج کا حال ہی میں افتتاح ہوا تھا۔ کلاسیز انٹرنس سے تھیں۔ اور ریسرچ کی بھی سہولت تھی کئی زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔ اس مقصد کے تحت بڑا اعلیٰ اسٹاف منتخب کیا گیا تھا۔ کوئی پروفیسر یا لکچرر ایسا نہ تھا جس نے فارن سے کوئی ڈگری حاصل نہ کی ہو۔ اور یہاں کی پرنسپل کے پاس تو ڈگریوں کی فوج تھی۔ بہت سے امیدواروں میں انھیں انتخاب کیا گیا تھا کالج کو کھلے بہت عرصہ نہ ہوا تھا۔ باقاعدہ تعلیم شروع ہو چکی تھی۔ اور ابھی ایڈمشن جاری تھے۔

پرنسپل مس زبیدہ شبیر احمد انگریزی لٹریچر پڑھاتی تھیں۔ ابھی انھوں نے ایم۔ اے، ایم۔ ایس سی کے بہت کم پیریڈز لئے تھے لیکن ان کی علمی قابلیت، لیکچر دینے کے دلنشین انداز اور سنجیدہ طبیعت کے ساتھ ساتھ ان کے پرکشش حسن کے چرچے شروع ہو گئے تھے۔ ان کی عمر کسی طرح اڑتیس یا چالیس سال سے کم نہ تھی۔ لیکن چہرے پر شباب تھا۔ جسم سڈول ڈھلا ہوا

موزوں قد و قامت، رفتار پر کشش، گفتگو کا انداز من موہنا۔۔۔
لڑکیاں ان سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ طلبا تک ان کے گرویدہ
تھے۔ جدھر سے وہ گزرتیں جان بوجھ کر راستوں میں آکھڑے
ہوتے۔ اگر ان کی سرسری نظر کسی پر پڑ جاتی، تو وہ ایک اجنبی سی
سنسنی اپنے جسم میں محسوس کئے بغیر نہ رہتا۔ لڑکیاں ان سے بات
کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتیں۔ اور کوشش کرتیں کہ یہ مقفل ابجد کسی
طرح کھل جائے۔ لیکن ان بہنوں کی کوشش کامیاب نہ ہوتی تھی
ان کی شخصیت سحر آفرین بھی تھی اور پراسرار بھی۔
وہ سب سے الگ تھلگ رہتی تھیں۔
انھیں کسی سے ہنستے بولتے یا باتیں کرتے نہیں دیکھا گیا۔ کوئی اگر کچھ پوچھتا تو
اسے جواب مل جاتا۔ لیکن وہ اسے خود سے گفتگو میں پہل کرنے کی شائق نہ تھیں
جن کلاسوں میں ان کے پیریڈ ہوتے وہاں مقررہ وقت پر پہنچ جاتیں اور گھنٹہ
جیسے ہی ختم ہوتا کلاس سے باہر نکل جاتیں۔ فری اوقات میں جب کہ اور
دوسری لیکچرار یا پروفیسر گپ شپ کرتے۔ اپنی نوزبیتن
فراموشی، زرے قہقہے لگاتے تب بھی مس شبیر احمد کوئی کتاب
سنبھالے برآمدے میں بیٹھ جاتیں۔ کتابیں ان کی ہمزاد بن کر رہ
گئی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب رہتی۔ اگر
کسی ساتھی پروفیسر نے انھیں چائے یا کافی آفر کی یا کہیں گھومنے
پھرنے کی دعوت دی، تب وہ بڑی نرمی سے معذرت کر لیتیں۔
رفتہ رفتہ ان کی شخصیت کے گرد اسرار و کشش کا ایک ہالہ سا
بن گیا۔ کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی ذات و شخصیت میں گہری دلچسپی

لیتا ہو۔

لیکن مس شبیر احمد کو پتہ نہ تھا کہ وہ سب کے لئے گفتگو کا موضوع بن چکی تھیں۔ لوگ ان کے علم سے مرغوب تھے لیکن ان کی خوبصورت پیشانی، گہری سیاہ آنکھوں، خوشنما ناک، اور سرخ لبوں سے متاثر زیادہ تھے۔ ویسے ان کا سارا حسن ان کی سنجیدگی میں پنہاں تھا۔ اپنے سفید جھاگ سے لباس میں بہت ہی دلکش نظر آتیں۔ انھیں رنگین یا بھڑکدار لباس میں کسی نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی تقلید میں ان کے بہت سے طالب علم سفید لباس پہننے لگے تھے۔

ان کی ہستی افسانہ بنتی جا رہی تھی۔ آخر اتنی خاموش طبع۔ اتنی سنجیدہ اور اسقدر تنہائی پسند کیوں ہیں۔

اگر ان کے ساتھی خاموشی کا سبب دریافت کرتے تو ان کی خاص دلکش مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر جاتی۔ پھر وہ بڑی سادگی سے کہتیں۔

"کلاسوں میں اتنا بولنا پڑتا ہے۔ کہ کچھ دیر چپ رہ کر دماغ کو سکون پہونچانا بہت ضروری ہے۔ ویسے آپ سب کی باتیں میں بہت دلچسپی سے سنتی ہوں۔"

ان کے ساتھی بحث پر آمادہ ہو جاتے۔ آپ نے خود کو ذات باہر کیوں کر رکھا ہے۔ ہمارا بھی تو دل چاہتا ہے۔ کہ آپ مختلف تفریحات میں ہمارا ساتھ دیں۔ گھومیں پھریں پکنک پر چلیں، دنیا کے کسی مشغلے سے آپ کو دلچسپی ہے کہ نہیں۔

مطالعہ میری سب سے بڑی تفریح ہے۔" لمبی چوڑی بحث کا جواب ان کی طرف سے بس اتنا ہی سا ملتا تھا۔

"سچ سچ بتائیے گا کہ دنیا کی کوئی کتاب آپ کے مطالعہ سے بچی بھی ہے؟"

"علم کیا ہے۔ شعور بے علمی" وہ کہتیں۔ "میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتی۔"

اس یادگار۔ دھندلی سی صبح کو بارش نے گہری پھوار کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہر طرف تازگی اور زندگی چھائی ہوئی تھی۔ سنگ مرمر کی طویل روشوں پر دو رویہ رکھے ہوئے گملوں میں رنگا رنگ پھول گویا اپنے حسن پر نازاں مسکرا رہے تھے۔ جھوم رہے تھے۔ لڑکیاں ہنستی چہلیں کرتی کلاسوں کی طرف رواں دواں تھیں۔ لڑکے موٹی موٹی آوازوں میں ہنستے باتیں کرتے۔ سیمینار کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بل ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ اور مس شبیر احمد کی آمد سے پہلے ان کی کلاس باقاعدہ سج جاتی تھی۔ ایک دن انھوں نے کہا تھا کہ ان کو ذہین طلباء کو پڑھا کے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ تب سے ہر لڑکی ہر لڑکا خود کو ذہین ثابت کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس روز بھی وہ سفید پاکیزہ لباس میں ملبوس کلاس روم میں داخل ہوئیں۔ سب طلباء ان کی تقدیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ چونکہ ابھی داخلے جاری تھے روز ایک نہ ایک نیا ایڈمیشن ہوتا ہی تھا۔ لہٰذا۔ ہر استاد کو روز ہی حاضری لینی پڑتی۔ ادھر

روز ہی ایک مبا نمبر نیا نام رجسٹر میں درج دکھائی دیتا۔ اسی قاعدے کے مطابق مس شبیر احمد بھی حاضری لیتی تھیں۔

اس دن بھی وہ کلاس میں نام اور نمبر سے طلبا کی حاضری لگا رہی تھیں۔ دفعتاً ایک نام پر رک گئیں۔

"نمبر بائیس صنم افتخار احمد ——!" اور ان کا جھکا ہوا سر اٹھ گیا۔

نمبر بائیس پر نگاہیں جم گئیں۔ ان کے سامنے تیسری قطار میں ایک لڑکی دکھائی دی۔

"جی ——!" ایک نرم و نازک سہمی ہوئی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ ہلکے ہلکے کاسنی رنگ کے لباس میں لپٹی۔ حباب سا دوپٹہ سر پر تھا۔ کوئی نئی لڑکی تھی۔ گھبرائی گھبرائی سی۔ اس کا خوبصورت سا چہرہ سفید ہو رہا تھا کیونکہ کلاس کے سب لڑکے لڑکیاں اسی کو دیکھنے لگے تھے۔ اور کچھ نظریں متحیر و متعجب سی پرنسپل پر بھی لگی تھیں۔

کیا بات تھی اس نام پر انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ اور نئی طالبہ کو دیکھ کیوں رہی تھیں۔ انھوں نے تو آج تک کسی کو بھی قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔ پھر آج ——!

اس چٹان کے اندر کچھ توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔

پرنسپل نے اپنی شفاف پیشانی پر جھلکنے والے پسینے کے قطرے ہتھیلی سے سمیٹے۔ دو ایک بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ اور پھر ایک لمحہ بعد دوسرے نام پکارنے لگیں۔

لڑکیوں میں مدھم سا شور ابھرا۔ لڑکوں نے پہلو بدلے کیونکہ
ان کی آواز کا ارتعاش کسی سے چھپا نہ رہ سکا۔

لڑکی اپنی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ اپنی پرنسپل کو اپنی طرف
متوجہ دیکھ کر وہ گلابی ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں کتاب پر تھیں
لمبی لمبی پلکوں کا عکس خوشنما گالوں پر عکس فگن تھا۔ لب
نیم وا تھے۔ پھر کلاس کے ختم تک اس نے نگاہیں نہیں اٹھائیں۔
پرنسپل مس شبیہ احمد رجسٹر سنبھالے اپنے اجلاس میں آ کے
بیٹھ گئیں۔

کالج ایریئے ہی میں ان کا ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ تھا
بنگلہ کیا چار کمروں کا ایک سوٹ تھا۔ صدر دروازے کے سامنے
والے بڑے کمرے کو آراستہ کر کے انھوں نے ڈرائنگ روم
کی حیثیت دے رکھی ہے۔ ایک کمرے میں لائبریری تھی تیسرا
کمرہ مختلف قسم کے سامان سے اٹا پڑا تھا۔ اور چوتھا کمرہ جس
کے بڑے بڑے دریچے کالج کے وسیع باغ کی طرف کھلتے
تھے۔ ان کی خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔

ابھی کالج کے بند ہونے میں دیر تھی لیکن انھوں نے اپنی
مددگار مسز ترپاٹھی کو دو گھنٹے کا کام سپرد کر کے گھر کی راہ لی۔

اپنا بھیگا ہوا خوبصورت سا اوور آل اتارے بغیر وہ کرسی پر
آ بیٹھیں اور سر پشت گاہ پر ٹیک دیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔

پچھواڑے کی طرف برآمدے کے شیڈ پر بوندیں جل ترنگ بجا رہی
تھیں۔ پیپل کے بڑے بڑے پتے بھیگنے پر بڑا پر شور احتجاج

کر رہے تھے۔ بوجھل ہوا گلاب اور ہار سنگھار کے پھولوں میں بسی کھڑکی سے چلتی کمرے میں آتی اور پردے کو متحرک کر کے بیزار سی سی چلی جاتی۔ بادل اب بھی تنے کھڑے تھے۔

خدایا یہ موسم میری زندگی میں بار بار اتنی جلدی کیوں آجاتا ہے۔ ان کا جی چاہا کہ وہ یکبارگی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ کیوں دکھ دے رہی تھیں وہ ظالم یادیں۔ جو کسی طرح ذہن کے دروازوں سے باہر نکلنے پر راضی نہ تھیں۔

وہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گم ہو چکی تھیں۔ ہر طرف مایوسیاں تھیں۔ ناکامیاں خوفزدہ کر رہی تھیں۔ پوری زندگی ایک نوحہ بن کر رہ گئی تھی جس میں آہوں کراہوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک حادثے ایک غم نے انھیں آنسوؤں کا کر رکھا تھا۔ ایسے میں تعلیم بالغان کا ادارہ ستارہ ذرہ بن کر زندگی کے تلاطم سمندر میں ابھرا جس نے اس بحر طوفان خیز میں مدھم سا اجالا پھیلا دیا۔ کچھ سہارا لوگوں نے دیا کچھ زندگی نے سبق سکھائے۔ اس جہان خراب میں زندہ رہنے کے لئے مضبوط دل بے حس دماغ اور فولادی جسم کی ضرورت ہوتی ہے جو انھوں نے رفتہ رفتہ حاصل کیا تھا۔ پھر تلخیوں نامرادیوں کو پس پشت ڈال کر وہ کسی روشن امید افزا راستے پر آگے ہی آگے بڑھتی گئیں۔ منزلوں کی تلاش تو بہت بعد کا مقصد تھا۔ دل میں تو آگ بھڑک رہی تھی انتقام کی۔ پھر راستے صاف ہوتے گئے نشیب و فراز آئے ضرور مگر اب ان میں اتنی طاقت تھی کہ وہ انھیں آسانی سے عبور کر گئیں

ٹھوکریں بھی لگیں ضرور مگر زخموں سے عادی دل ان کی تکلیف سے بے گیا۔

ادھر انتقام کی آگ شعلوں میں بدلنے لگی۔ دماغ میں بدلے کے بھکڑ چلنے لگے۔ آندھیاں اٹھنے لگیں۔ یہ احساس دم بہ دم تیز ہوتا گیا۔ کہ نیچے کم ظرف سے بدلہ اونچا ہو کر ہی لیا جا سکتا تھا۔ بعض دفعہ عفو و درگزر کمزوری اور حماقت کہلاتے ہیں۔ انسان اپنا بدلہ لے سکتا ہو تو ضرور لے دانت کے بدلے دانت آنکھ کے بدلے آنکھ۔ اور یہاں تو معاملہ جان کے بدلے جان کا تھا۔ وہ ہولناک بدلے کا خیال کسی وقت دل و دماغ سے خارج نہ کر سکیں۔

اور اس خیال نے عجیب سی ہمت دلائی۔ ایک کرشمہ دکھایا۔ انھوں نے اپنی تعلیم پر اتنی توجہ دی تھی۔ کہ کند ذہنی محض سراب ثابت ہوئی جب وہ ساتویں جماعت میں کامیاب ہوئیں۔ اور اپنی رپورٹ اپنے بہنوئی رضا صاحب کو دکھائی تو وہ حیرت و مسرت سے ایک دم ششدر ان کی شکل تکتے رہ گئے۔ پھر بڑی بہن نفیسہ سے دنگ ہو کر پوچھا تھا۔

"سچ کہو یہ تمھارا ہی رزلٹ ہے کہ کسی ہم نام کی رزلٹ رپورٹ اٹھا لائی ہو"

"... جو بھی سمجھئے" فرط انبساط سے ان کا دل پہلی بار دھڑکا ... مجھے کسی طرح میٹرک کے لئے تیار کرا دیجئے۔

اور ... رضا صاحب نے بے خود ہو کر انھیں سینے سے لگا لیا "تم سے تو کرامت ظہور میں آئی ہے۔ میں خود تمھیں میٹرک

سے کے لئے پڑھاؤں گا۔ دیکھا تم نے کر۔ محنت اور لگن نے بالآخر تمہارا یہ خیال غلط ثابت کر دیا کہ تم پڑھ نہیں سکتیں تم تو بہت دور سے بازی لے گئیں۔

بس ایک جنون تھا انھیں۔ کہ جہالت کا داغ ان کی شخصیت پر سے مٹ جائے۔ انھوں نے اپنی ذات سے نبرد آزمائی شروع کر دی۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ بس پڑھائی تھی اور وہ تھیں۔ انھوں نے اپنی کند ذہنی کو بار بار شکست دی اپنے آپ سے جنگ کرنے کے لئے بڑی جی داری کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ لیکن انھوں نے خود سے جنگ جاری رکھی۔ اعلیٰ ہیں خود کو فنا کر ڈالا تھا۔ انھیں کچھ کرنا تھا کچھ بننا تھا۔ ابا کے خوابوں کو تعبیر میں ڈھالنا تھا۔ یہ کلنک اپنی پیشانی سے مٹانا تھا۔ کہ اسے لوگوں نے جاہل کہہ کر تعلیمی دائرے سے خارج کر رکھا تھا۔

پھر چھ ماہ بعد ہی انھوں نے میٹرک نمایاں پوزیشن سے پاس کیا۔ تو خود بھی متعجب رہ گئیں۔ کیا وہ وہی غبی، ڈل اور ٹھس لڑکی تھیں۔ جن کا نام فرسٹ ڈویژن کی لسٹ میں۔ بہت چمک رہا تھا۔

اس کامیابی نے ان کی ہمت اور شوق کو مہمیز لگا دی۔ اب راہیں آسان اور منزل قریب تھی۔ کامیابی، سرخوشی، فتح کی منزل۔ انھوں نے انٹر میں ایڈمیشن لے لیا۔
گھر والے پریشان تھے۔ آخر ایک پتھر یکبارگی مکھن کیسے ہو گیا

ان کے چھوٹے بھائی شبیر احمد جناب جری ریٹائرڈ سائنس داں تھے اور ذہین بچوں کے باپ تھے بڑی حیرت اور مسرت سے بولے "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زوبی کے ذہن کو پر لگ گئے ہیں۔ وہ تو علمی میدان میں اڑ رہی ہے۔ یا تو پھر یہ ہوا ہوگا، کہ انھوں نے کسی عالم کا دماغ اپنے سر میں رکھوا لیا ہے۔"

آج کل تو سرجری کے کمالات ایسے ہی تجربے دکھا رہے ہیں۔" انکی خوش مزاج بیوی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ ڈاکٹر تھیں ایسے کمالات دیکھ چکی تھیں

انہیں زوبی کی ماضی کی کہانی معلوم تھی شبیر اور شمیم اپنی موروثی کوٹھی میں رہتے تھے شبیر کے بڑے بھائی امیر احمد امریکہ کے بڑے بزنس مین تھے انھوں نے رفتہ رفتہ کر کے ایک کثیر رقم بھائی کو بھجوائی تھی۔ کہ ان کا بنا ہوا چھوٹا سا گھر منہدم کر کے وہاں کوٹھی تعمیر کی جائے لیکن اس وسیع و عریض خوبصورت دو منزلہ کوٹھی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ان کے والد بشیر احمد صاحب کا دیوان خانہ اسی جگہ جوں کا توں رہ گیا تھا۔ جیسا ان کی زندگی میں مرحوم رکھتے تھے اور اندرونی حصے میں اماں کا کمرہ بھی اسی حالت میں تھا۔ دونوں کمرے ان کی یادگار کے طور پر ویسے ہی رکھ دئیے گئے تھے۔

امیر احمد دو تین بار وطن آئے تھے۔ انھیں زوبی کی المناک زندگی کے سارے حالات معلوم ہوئے۔ انھوں نے چاہا بھی تھا کہ رضا صاحب کو اپنے ساتھ نظام آباد لے جائیں اور اگر بہن کو اعتماد نہ بھی لیں تو اخبار کو ایسی ایسی کھری کھری سنا کے آئیں کہ ان کی طبیعت بھی ہری ہو جائے۔ لیکن زوبی نے منع کر دیا۔ "بھیا! وہ لوگ اپنی کرنی کا تماشہ دیکھ چکے۔ ایک دفعہ جھکنے

ہوئے شیخ میراں ادھر آنکلے تھے۔ مجھ سے بھی ملے تھے۔ میں نے تو ان سے کچھ پوچھا نہیں۔ وہ خود ہی بتا رہے تھے کہ عرصہ ہوا۔۔ خان بہادر صاحب مر گئے۔ ان کی بیوی بھی عبرت ناک حالت میں مری تھیں۔ اسپتال میں پڑی ایڑیاں رگڑتی تھیں۔ چاہنے والے بیٹے، بیٹی، بہو، داماد۔ کوئی بھی ان کے پاس جاتا نہ تھا۔ جب مری ہیں تو قریب کوئی نہ تھا۔ کہ یٰسین شریف سناتا۔ منہ میں پانی ہی ٹپکاتا۔ اور آپ کو ثمر تو یاد ہو گی۔ جس نے مجھ پر بہتان باندھا تھا۔

"ہاں وہ تمہاری نند تھی شاید۔!" عذرا نے کہا۔

ان کی لڑکی تھی۔

اسے کیا ہوا۔؟

وہ بھی نہ اکھو پچی۔ ایکسیڈنٹ میں اس کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی۔" زیدی نے بتایا۔" اب ماں باپ، اور بڑے بھائیوں پر پڑی ہے۔ رسواہٹ کہ تنہائی، معذوری اور احساس، اور بے بسی سے آدھی پاگل ہو چکی ہے۔ کسی نے اس سے شادی کی حامی نہیں بھری۔ حالانکہ اس کے والد تو دو لاکھ اور تین لاکھ کا بیش قیمت جہیز دینے پر تیار تھے۔"

"خدا بچائے۔" عذرا نے کہا۔" لوگ کسی کا برا چاہتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ ان کا بھی برا ہو سکتا ہے۔

"خیر ان سب کی باتیں رہنے دو۔ ہمیں تو تمہارے نام نہاد شوہر سے مطلب ہے۔ ہم تو ان کا مزاج درست کرنے جا رہے ہیں۔" ارشد نے کہا۔" وہ مزے میں دندنا رہے ہیں۔ یہ کم سے کم ان کا ۔۔۔!"

"منزے میں نہیں ہیں بھیّا" روبی نے بتایا۔ "شیخ صاحب کہہ رہے تھے کہ ان پر بھی مصیبتیں آئی ہیں۔ میاں بیوی کسی قریبی گاؤں ہیں ——!"

"میاں بیوی۔ کیا مطلب؟ کیا افتخار نے دوسری شادی کرلی ہے؟" امیر احمد نے حیرت سے پوچھا۔

"ہیجئے آپ کو پتہ نہیں"۔ شائستہ نے جواب دیا۔ "انھوں نے تو کئی سال پہلے اسی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ جو ان کی منگیتر تھی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"شبیہ اور رضا بھائی نے خطوں میں ذکر کیا تھا۔ ساتھ میں تاکید کردی تھی کہ آپ کو خط نہ بتائے جائیں۔ صدمہ ہوگا۔ میں نے انہیں بتایا" شائستہ نے کہا۔

"خیر ہوگا۔ تم کہہ رہی تھیں نہ روبی کو میاں بیوی کسی گاؤں میں ——" امیر احمد نے کہا۔ "جی ہاں کسی کی شادی میں گئے تھے۔ دو دن بعد واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ گھر میں جھاڑو پھر گئی ہے" روبی نے کہا۔ "چوروں نے سب کچھ صاف کردیا حتیٰ کہ صحن میں بندھی ہوئی بھینس تک کھول لے گئے۔

واقعی بڑا افسوس ہوا" امیر احمد نے کہا۔ "بے چارہ۔ اب کوئی اولاد ہے اس کے؟"

"ایک لڑکی ہے سنا ہے تین بچے ہوئے تھے۔ مگر وہ کسی پُراسرار بیماری سے ڈیڑھ ڈیڑھ سال کے ہو کر مر گئے۔ اس صدمے نے افتخار صاحب کو بوڑھا کر ڈالا اور ان کی بیوی کو پاگل کردیا ہے" روبی نے کہا۔ اور

ایک چھپی ہوئی آہ بن کر رہ گئی۔

"رضا۔۔۔؟" امیر احمد نے کہا۔

وہ ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"بھائی اس عرصے میں کہیں پتہ نہ چلا کہ ۔۔۔!" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

رضا نے ان کا مافی الضمیر پہچان کر نفی میں سر ہلا دیا۔

امیر احمد اپنی بہن کی علمی ترقی سے بے حد خوش تھے۔ ان کے لئے بھی زبیدہ جیسی غبی کند ذہن، گستاخ زبان دراز لڑکی میں یہ تعجب خیز انقلاب بڑا کرشمہ نظر آیا۔ قلب ماہیت کے ساتھ ساتھ اس کی عادتوں میں بھی ایک بڑا فرق آ گیا تھا۔ امیر احمد امریکہ سدھار گئے۔ اور ان دنوں کشمیر جرمنی سے واپس آ گئے!۔ ان کی شادی ہوئی۔ انہیں سائنس لیب میں ایک بڑا عہدہ ملا۔ گھر میں خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔

انٹرنس میں زبیدہ نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اور بی اے میں داخلہ لے لیا۔ جوں جوں اس کے ذہن پر تعلیم قلعی کر رہی تھی۔ ویسے ویسے اسے زندگی گزارنے کا تجربہ ہو رہا تھا۔ پہلے دنیا بڑی عجیب پر اسرار دلکش و دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ اب بچوں کا کھیل لگتی کھیل کے بڑے سے میدان میں بہت سے بچے جمع ہو جاتے ہیں۔ مختلف قسم کے کھیل کھیلتے ہیں۔ لڑتے جھگڑتے ہیں۔ مارتے پیٹتے ہیں۔ ایک دوسرے پر اپنی برتری طاقت کا گھمنڈ جتاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ شام ہو جاتی ہے اور وہ سب اپنے اپنے گھروں کو

ٹوٹ ـــ جاتے ہیں۔ یہ دنیا بازیچۂ اطفال نہیں ہے۔ تو پھر کیا ہے۔ یہاں کسی چیز کو قرار نہیں ثبات نہیں۔ ایک صبح ایک آدمی حسب معمول صحت مند چاق چوبند اور مسرور اٹھتا ہے۔ دوپہر کو اس کے ٹھوکر لگتی ہے۔ گرتا ہے مر جاتا ہے اور شام تک مٹی میں چھپا دیا جاتا ہے۔ ان چلتی پھرتی زندہ ہستیوں کو پل بھر میں لاش کہلانا پڑتا ہے۔ کوئی حقیقت نہ دنیا کی ہے نہ کوئی اہمیت انسانی زندگی کی ـــ یہ سارا کھیل تماشا بس پل بھر کا ہے۔

بی۔ اے آنرز میں انھوں نے ڈومینین ٹاپ کیا تھا۔ اور اخبار میں اپنا رزلٹ دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں تھیں۔

شہیر اور شبنم وغیرہ جو فرط مسرت سے دیوانے ہو رہے تھے ہکا بکا رہ گئے۔

"اے آپا! یہ بھی کوئی بات ہے" شبنم نے کہا "اتنی زبردست خوشی کے موقع پر تم رو رہی ہو۔

رضا اور شائستہ وغیرہ بھی رزلٹ دیکھ کر فوراً بھاگے آئے تھے۔ ان کی گریہ وزاری دیکھ کر حیران تھے۔

"ایک دن بشیر نے اسی طرح ڈومینین ٹاپ کیا تھا" ہچکیاں لیتے ہوئے زوبی نے کہا۔ "میں نے اس سے پوچھا تھا۔ یہ کیا ہوتا ہے آج یہ خوشی مجھے بھی نصیب ہوئی ہے ـــ مگر میں خوش نہیں"

"ہمیشہ ہر حال میں تم خدا کا شکر ادا کرتی اور اپنے حال پر شاکر رہی ہو۔ زوبی۔ اب یہ آنسو کیوں؟" رضا نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "دیکھو تو تقدیر تم پر کس طرح مہربان اور اللہ تم سے

کس انداز سے راضی ہوا ہے۔

"زندگی صرف میری ہی خوشی کا نام تو نہیں دولہا بھائی۔" زوبی نے کہا۔ "میں ایک اندھا دھند جذبہ کے تحت خود کو کسوٹی پر کس رہی ہوں۔ کوئی موقعہ تو مجھے بھی ملے گا۔ مگر کب؟"

ان کی بہکی باتوں کو مسرّت کی زیادتی کا نتیجہ سمجھ کر رضا نے انھیں دوسری طرف متوجہ کر لیا۔

"بھئی آج ہم یہیں کھانا کھائیں گے۔ زوبی آج تم مرغ پلاؤ اور فروٹ کریم کسٹرڈ پکاؤ گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تمھاری مدد کوئی نہ کرے گا۔ ہم سب مہمان ہیں کیا۔؟"

ہائے اللہ یہ زبردستی کی دعوت کیا۔" شائستہ ہنس کر بولیں۔

"زوبی نے اپنے منھ سے کچھ کہا تھوڑی ہے۔"

"نہ کہے۔ ہم اس کی خاموشی کی زبان سمجھتے ہیں۔" رضا بھی ہنس کر بولے۔

"اسی طرح آپ ایک ایک گھر میں جا کر لوگوں کی خاموشی کی زبان سمجھنے لگے تو کوئی گھر میں گھسنے نہ دے گا۔ بلکہ آپ دروازے کے سامنے سے بھی گزریں گے تو دھڑا دھڑ دروازے بند ہو جائیں گے۔" شبنم بھی ہنسنے لگی۔

"ہم دیوار میں پھلانگ جائیں گے۔" رضا بولے۔

"جھگڑا ختم کر دیجیے!" زوبی نے ہاتھ اٹھا کر انھیں روکا۔ "میں کسی کی مدد لئے بغیر پکاؤں گی۔ مگر دولہا بھائی تھیلا سنبھالئے اور جیب کا وزن کم کیجیے۔ مرغ مصالحے تو آپ ہی لائیں گے نا۔"

تو بھائی یہ تو وہی بات ہوئی کہ جو اندھیر سے کو کہے وہی تیل لانے جائے۔" رضانے کہا۔" اب یہ بتایئے کہ زوبی کا آگے کا ارادہ کیا ہے؟" شبنم نے رضا سے پوچھا۔

فرنٹیئر میل ایک بار پھر پٹری پر آ گیا ہے۔" رضانے کہا۔"چنانچہ۔"
" طوفان میل۔" شہیر نے لقمہ دیا۔

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔" رضانے کہا۔ طوفان میل چھوٹے موٹے.. اسٹیشنوں پر نہیں رکتا۔ وہ کسی بڑے جنکشن پر رکتا ہے۔ لہٰذا اب اس طوفان میل کو بھی کسی بہت بڑے جنکشن پر ٹھہرنا ہے۔"

"میں تو حیران ہوں۔" شہیر نے دانتوں میں انگلی دے کر کہا۔"کبھی کبھی آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگتا ہوں۔ یہ وہی محترمہ ہیں۔ ٹکنی کلر، جھبر جھبر سے بال۔ زبان منہ سے باہر۔"

"اے شہیر توبہ کرو۔ ا کیوں میری زبان خدانخواستہ منہ سے باہر لٹک جاتی۔" زوبی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"منہ کے اندر وہ بے چاری کبھی کبھار رہ ہی جاتی تھی۔" شہیر نے ہنس کر کہا۔

"اماں کے ساتھ بھی میں نے بہت گستاخیاں کیں۔ آہ۔ ہا۔ کاش اماں آج زندہ ہوتیں۔" زوبی نے کہا

رضانے دیکھا کہ موضوع پھر غمناک یادوں کی طرف رخ کر رہا ہے لہٰذا انھوں نے نعرہ لگایا۔" دوپہر نزدیک ہے۔ میں بھوک کا کچا ہوں۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں گی۔ یہاں ابھی تک مرغ نے بانگ تک نہیں دی۔"

"ارے تو کیا مرغ کھائیے گا ضرور۔ ارات کی ارہر کی دال رکھی ہے گھی کی بگھری ہے ۔۔۔ میں گرم پھلکے ڈالے دیتی ہوں" شبنم نے کہا۔ اسے رخسار کی خوشمزاجی بہت پسند تھی۔

جی گھی کی بگھری دال آپ باسی پھلکوں کے ساتھ اطمینان سے کھائیے" رضا نے سر ہلایا "لیکن میرے سامنے مرغ کی چار دن ٹانگیں آنی چاہئیں"

"اللہ دولہا بھائی آج تو آپ چار ٹانگوں والا ہی مرغ لائیں گے" شبنم نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ" رضا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "میرے ذہن میں مسلم بکرے کا تصور تھا۔ اچھا اب لاؤ تھیلا۔ یہ ارولی بھی جھگتا دوں معلوم نہیں کتنے کا ملے گا۔ کیا ایک ننھا سا چوزہ کافی نہیں ہو سکتا"

"ہائے خدایا۔ کنجوسی کی حد کر دی آپ نے" شبنم نے للکارا۔ "سنئے مرغ بھی تین عدد ہوں۔ اللہ رکھے ہم سب ہیں۔ اور پھر بچے بالے مرغ پلاؤ پر تو سب ہی ندیدوں کی طرح گرتے ہی ہیں"

"معلوم ہے مجھے تم میرا دیوالیہ بنا کر چھوڑو گی!" رضا نے چہرے پر بے کسی طاری کر لی۔

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ آپ اپنا بینک بیلنس محفوظ رکھئے ارہر کی دال ۔۔۔۔!" شبنم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مگر رضا زوبی کے ہاتھ سے تھیلا جھپٹ کر باہر چل دیئے۔

زوبی کو سرکار کی طرف سے وظیفہ منظور ہوا تھا جس تعلیم کے لئے

جس ملک میں چاہے چلی جائے۔ تین سال اس نے لندن میں گزارے۔ انگریزی صحافت کی اعلیٰ ڈگری لی۔ اس کے بعد اس نے ایل ٹی اور ایم۔ فل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اور سرکاری اسکالرشپ پر ڈاکٹریٹ کر کے پانچ سال بعد لندن سے وطن واپس ہوئی۔ تو ایک دوسری ہی شخصیت تھی۔

لندن ہی میں اسے بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے معزز عہدے آفر کئے تھے۔ لیکن اس نے قبول نہیں کئے۔ وطن واپس آگئی۔! یہاں اس کی تعلیمی قابلیت کی ٹکر کی کوئی دوسری شخصیت نہ تھی۔ (ذہنی) وہ کچھ کرنے نہ کرنے کی بات سوچ ہی رہی تھی کہ اندرا میموریل کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اور اسے یہاں کا پرنسپل منتخب کرتے ہوئے بڑے جگادری معاملہ فہم افراد نے عزت افزائی خیال کی!۔

اور آج مس زبیدہ بنت احمد کے پاس کیا کچھ نہ تھا۔ صورت سیرت، قسمت، عزت، دولت اور شہرت سبھی کچھ تھا۔ تقدیر اور قدرت نے اسے جی کھول کے سرفراز کیا تھا۔ بس ایک چیز اس کے پاس نہ تھی۔ محبت۔ ماتا کا سمندر اب بھی اس کے سینے میں ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ ماتا اب بھی کلپتی تھی۔ اسے اپنی بچی یاد آتی تو وہ بیس سال پہلے والی لڑکی بن جاتی۔ جو بچی کی یاد میں صحن میں سر پٹخ پٹخ کر روتی تھی۔

زمانہ کہیں سے کہیں تک پہونچا تھا۔

اماں اور ابا کی قبروں کے بس نشان باقی رہ گئے تھے۔ امیر احمد کا بزنس امریکہ میں اتنا پھیل چکا تھا کہ انھیں اپنوں کو یاد کرنے کی

بھی فرصت اب نہ ملتی تھی۔ وہ پُر مسرت محبتیں اور غمگسار اب بھی ویسے ہی تھے۔ اب بھی ہر ماہ دو ہزار کی رقم کا ڈرافٹ زوبی کو ملتا تھا۔ اس نے ہزار بار لکھا تھا کہ بھیا اب مجھے ضرورت نہیں۔ لیکن امیر احمد نے یہی جواب دیا تھا کہ تمھیں خدا اور دے۔ لیکن یہ تو میری خوشی ہے۔ پھر تین سال پہلے رضا بھی باہر چلے گئے تھے۔ شبیر ایک سائنس تجربہ گاہ میں کام کرتے تھے۔ ان کی بیوی ڈاکٹر تھیں دونوں بے حد مصروف رہتے تھے۔ شائستہ کے باہر جانے کی ضروری کارروائی جاری تھی۔ چند دنوں بعد وہ بھی چل دیتیں۔ بہرحال سب زندگی کو بھرپور انداز میں برتنے پر جی جان سے جٹے ہوئے تھے۔ اور وہ زندگی کو اچھی یا بری طرح سے زیادہ شبیر احمد کو بھی بھگتنا تھا۔ شبیر نے بہت چاہا تھا کہ وہ انھیں کے ساتھ رہیں۔ لیکن انھیں کالج کے قریب کا نیا تعمیر کیا ہوا چھوٹا سا بنگلہ بہت پسند آیا۔ وہ اپنی ایک خاص خادمہ کے ساتھ اس بنگلے میں فروکش ہو گئیں۔

زمانہ دبے قدموں بھاگا تھا۔ اور انھیں عمر کی اڑتیسویں منزل پر لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں سنجیدگی اور بردباری ان کا مزاج بن گئی تھی۔ دنیا کی ٹھوکر انسان کے اچھے برے بننے کا ایک بہانہ ہوتی ہے۔ بعض لوگ مسلسل ناکامیوں کے بعد خود سے بدلہ لینے کے لیے خطرناک راہوں پر خود سے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ بعض دوسروں سے بدلہ لینے کے لیے سنجیدہ مزاج بن جاتے ہیں۔ آتش فشاں کی طرح خاموش مگر جن کے بطن میں ہولناک لاوا پکتا رہتا ہے۔

وہ رضا کی ممنون تھیں۔ جنھوں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ سمجھایا تھا

اور ایک روشن جادۂ حیات پر لا کھڑا کیا تھا۔ کسی کو یقین ہی نہ آتا!
کل کی وہ زبان دراز، گستاخ اور جاہل سی لڑکی۔ آج کی پُر وقار تعلیم
یافتہ، تفارن رٹرنڈ پرنسپل پروفیسر زبیدہ شبیر احمد ہے۔

اپنے نام کے آگے انھوں نے جان بوجھ کر مس کا اضافہ کیا تھا۔ پچھلی
تاریک یادوں کا ہلکا سا سایہ بھی انھیں اپنے ذہن و شخصیت پر ڈالنا گوارہ
نہ تھا۔ وہ عرصہ مختصر سا ان کی زندگی کا ایک سیاہ بادل تھا۔ جو ان پر
غم و الم رنج و نحوست کی بارش برسا کر زمانے کے دوش پر اڑتا چلا
گیا تھا۔ اب تو ان کے مطلع حیات پر مقدر کا روشن ستارہ بڑی آب
و تاب سے جگمگا رہا تھا۔

لیکن جب کبھی وہ تنہا ہوتیں تو ہمیشہ ایک ننھّی قلقاریاں مارتی
ان کے پہلو میں ہوتی۔ کبھی سینے پر لیٹ کے سوتی کبھی اس کے رونے
کی دلکش آواز دل کی ویران دنیا میں گونجتی!۔ بچّے کے رونے کی
آواز سے زیادہ دلکش اور مسحور کن راگ دنیا میں دوسرا کون سا ہے
معلوم نہیں کس نے اسے اٹھا لیا۔ اور اب میری بچّی اس بھری
پُری وسیع دنیا میں کہیں ہے بھی کہ نہیں۔ اگر آج وہ ہوتی تو سترہ
سال کی تو خیز دوشیزہ ہوتی۔ کاش اگر یہ خلش دل سے مٹ جاتی
اگر یہ کانٹا روح سے نکل جاتا تو زندگی کتنی حسین ہوتی یہ غم زبیدہ
کو سنجیدہ نہ بنا دیتا تو کیا کرتا۔؟

اس عرصے میں کئی لوگوں نے اس کا دائمی قرب چاہا تھا لیکن
وہ سب سے گریزاں اور محتاط رہی تھیں۔ لیکن ایک صاحب کچھ
مستقل مزاج تھے۔ گاہے گاہے اپنی بہن کی تعلیمی حالت کے بارے

ہیں پر چھپنے آتے اور دیر تک جمے رہتے! ان کے نزدیک تو بس تھیں۔ ایک دفعہ شائستہ نے اور ایک بار شبنم نے کہا تھا:
"تمھیں جنون تھا آپا کہ ان پڑھ ہونے کا کلنک تمھاری پیشانی سے مٹ جائے۔ وہ مٹ چکا مگر تمھاری اس تعجب انگیز تبدیلی دیکھنے کو وہ خاص آدمی کہاں آیا؟ وہ تو تمھیں کبھی کا بھول بیٹھا۔ اب دنیا میں ہے یا دنیا سے جا چکا۔ تمھیں یہ بھی پتہ نہیں۔ اب تم اپنے بارے میں سنجیدگی سے سوچو آپا کہ تم ابھی جوان ہو بے حد حسین ہو۔ قابل رشک قابلیت کی مالک ہو۔ تم تو ملک کے کسی شہزادے کی بیوی بننے کے لائق ہو۔ اپنی ذات کو یوں ضائع نہ کرو۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ شکیب صاحب ہر طرح معقول آدمی ہیں۔ تمھاری شاگرد کے بھائی بھی ہیں۔ تم انھیں تھوڑا بہت جان بھی گئی ہو۔ ان کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں"!
"بی بی ہم نے بھی بہت کہا۔ کہہ کہہ کے تھک گئے"۔ شائستہ نے کہا۔ "مگر ان کا انکار، اقرار سے نہ بدلا۔"
"بدلے گا بھی نہیں باجی۔!" زبیدہ نے کہا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ "کچی مٹی میں سنے ہوئے ٹیڑھے ترچھے نقش پختہ ہو کے بہت ڈراؤنے ہو گئے ہیں۔ تب ادراک نہ تھا۔ ظلم و ستم کا صحیح اندازہ بھی نہ تھا۔ اب ادراک بیدار شعور زندہ ہے۔ ظلم و زیادتی کو بڑھا چڑھا کر محسوس کرنے والا نہیں۔ اب اچھی بھلی زندگی کو روگ لگانا نہیں ہے۔ ارے تم لوگ یہ بار بار مجھے اس طرح ڈسٹرب کیوں کر دیتی ہو۔ کیا مقصد ہے تمھاری نظر میں شادی؟

کا! یہی نا کہ بے سہارا لڑکی کو سہارا مل جائے۔ ایک چھت کا سایہ نصیب ہو۔ روٹی کپڑے کا ٹھکانہ ہو جائے۔ یا پھر نسل انسانی میں اضافہ ہو۔ تو مجھے بتاؤ کہ خدا نے آج مجھے کیا کچھ نہیں دیا۔ اب مجھے سہارے کی یا کسی رفاقت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نہ میں یہ گوارہ کر سکتی ہوں۔ کہ کوئی مرد مجھ پر حکومت کرے۔ اپنی برتری جتائے۔ مجھے اپنا محتاج سمجھے۔"

"تم خود اس پر حکومت کرو گی۔" شائستہ نے کہا۔

"مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجھ سے محبت کرنے کے لئے آپ سب سلامت ہیں۔ میں مزے میں ہوں نہ کسی کی محکوم نہ کسی کی محتاج۔ شوہر ایک شکنجہ ہوتا ہے جس میں بیوی جکڑ کے رہ جاتی ہے۔ مجھے نہیں چاہیئے۔"

"جب سے لکچرر بنی ہو۔ تقریر اچھی کر لیتی ہو۔" شائستہ نے کہا۔

"آپا۔ تم نے جو سرمایہ اکٹھا کر لیا ہے۔ وہ تو آخر کسی پر خرچ کرو گی ہی۔ تو کیوں نہ اپنی اولاد پر ——— !"

"چپ رہو شبنم مارکھانے والی باتیں مت کرو۔ یہ میری اولاد نہیں ہے کیا۔ تمہارے اور باجی کے بچے۔" زوبی کو ناگوار گزرا۔

"مگر یہ شکیب صاحب جو ہاتھ پاؤں دھو کر تمہارے پیچھے پڑے ہیں۔" شائستہ نے کہا۔

"میری طرف سے وہ پاؤں بھی دھو لیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو وہ چاہتے ہیں۔ مجھے کبھی کسی حال میں شادی نہیں کرنی ہے۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر کسی نے کچھ نہیں کہا۔

لیکن ایک صاحب تھے۔ ثکیب صاحب! اپنی بہن کے ایڈمیشن کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔ ایڈمیشن ہو گیا۔ اب ان کی آمد کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ مگر وہ آتے تھے اور پرنسپل ہی کے اجلاس پر جلوہ افروز ہو جاتے تھے۔ ایک دو دن بعد زبیدہ نے خاصی درشت آواز میں کہا۔

"آپ کا یہاں کیا کام ہے۔ کیوں آتے ہیں"؟

وہ عجیب سی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کے اس سوال کا جواب کیا دوں۔ محترمہ۔ میں خود سے یہاں نہیں آتا۔ کوئی کشش ہے جو مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے۔ بے خود و بے خبر سا گھر سے نکلتا ہوں۔ اور جب ہوش میں آتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ یہاں موجود ہوں"۔

"آپ کی یہ بیماری خطرناک ہے"۔ زبیدہ نے کہا۔ "اسے طبّی زبان میں کابوس کہتے ہیں۔ اس عالت میں آپ گھر سے نہ نکلا کیجئے۔ راستوں میں بھیڑ بہت ہوتی ہے ہر روز حادثے ہوتے ہیں۔۔ کہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ـــــــ!

"گھر نہیں اسے پاگل خانہ کہئے۔ وہاں ایک ننھّی منّی بچی کے سوا میرا ہے ہی کون۔"؟

"ننھّی منّی بچّی"!؟۔ زبیدہ کا دل دھڑک اٹھا۔ کہیں وہی تو نہیں۔ کیا عمر ہے اس کی"؟۔

"تین سال"۔

"اوہ"۔

"آپ کو افسوس ہوا۔"

"اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟"

کیونکہ وہ قابل رحم ہے اس کی ماں نہیں ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ کتنی دشواریوں سے میں نے اسے پالا پوسا ہے۔ میرا کوئی عزیز رشتہ دار اس دنیا میں موجود نہیں۔" شکیب صاحب کا لہجہ پُر درد ہو گیا۔ "اس کا بھی کوئی نہ تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کی رفاقت مانگی تھی۔ شادی کے بعد ایک سال مسرتوں کے ہنڈولوں میں جھولا کئے اور پھر تقدیر نے ہماری خوشیوں کا بڑا المناک تاوان لیا۔ نازنین کی پیدائش میں جبیں چل بسی۔ وہ جانتی ہی نہیں کہ ماں کیا چیز ہوتی ہے۔ میں نے ہی اسے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" زبیدہ پر ایسی باتوں کا اثر بہت کم ہوتا تھا۔ "یہاں کسی کی ماں نہیں ہے کسی کا باپ نہیں ہے کسی کا کوئی بھی نہیں ہے۔ آدمی کس کس کا دکھ بانٹے کس کس کا بوجھ ہلکا کرے! پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ یہاں کیوں تشریف لاتے ہیں۔"

انھیں ان کا دیر تک بیٹھنا سخت گراں گزرتا تھا۔ لیکچرار اور پروفیسر برابر ان کے اس پر آیا جایا کرتے تھے۔ بات کا بتنگڑ بنتے دیر کیا لگتی وہ ابھی جوان حسین اور پرکشش تھی۔ شکیب بھی خوبرو تھے۔ وجیہہ اور شاندار تھے۔ زبیدہ اپنے دامن پر اسکینڈل کا ہلکا سا اثر بھی برداشت نہ کر سکتی۔

اس کے اصرار پر انھوں نے ایک سائل کا سا گداز رحم طلبی کا

انداز اختیار کر کے کہا۔ "میں نے سنا ہے آپ بھی دنیا میں اکیلی ہیں۔ اس لئے۔ میں یہ درخواست کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ کیوں نہ آپ اور ـــــ اور ـــــ معاف کیجئے گا۔ میں ـ مطلب یہ کہ ـــــ !"

زبیدہ کا چہرہ غصّہ سے تمتما گیا۔ "آپ نے غلط سنا ہے میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے سب عزیز رشتہ دار موجود ہیں۔ مجھے کسی کی رفاقت کی ضرورت نہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

وہ بڑی مشکل سے تو جا سکتے تھے۔ اور کبھی پھر آ موجود ہوتے تھے ایک بار شبنم نے انہیں دیکھا تھا اور ان کے حق میں بولنے لگی تھیں لیکن زبیدہ نے کھردرے انداز میں منع کر دیا۔ کہ وہ ایسا مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

"تم میں بڑھی روح حلول کر گئی ہے۔" شبنم نے خفا ہو کر کہا تھا۔

اور وہ دھندلی صبح جب ان کے نصیب کے افق میں طلوع ہوئی۔ اس نے تو ان کی زندگی کا رخ ہی موڑ کر رکھ دیا۔

انھوں نے کلاس نہیں لی۔ تھکی تھکی سی اپنے گھر آ گئیں اور اپنے وجود کو کرسی پر گرا دیا۔ بارش کا جلترنگ جیسے کہہ رہا تھا ـــــ صنم افتخار احمد، صنم افتخار احمد ـــــ

انھیں یوں لگا جیسے ساری کائنات اسی شور سے گونج رہی تھی۔ ان کے سر کی رگیں کھنچنے لگیں۔ خون گرم ہو کر کنپٹیوں میں میں ٹھوکریں لگانے لگا۔ دل رکتا ہوا معلوم ہوا۔ اور انھوں نے بے چین ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

خدایا۔ دنیا میں سیکڑوں افتخار احمد ہوں گے۔ اس نام پر میرا دل کیوں دھڑکنے لگتا ہے۔ یہ ظالم نام لوح دماغ سے مٹ کیوں نہیں جاتا۔ اب میں نے کیا آس لگا رکھی ہے۔ اتنی پاگل کیوں ہو رہی ہو۔ سب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس بے درد اور سنگدل شخص کو میں نے اپنی زندگی سے نکال پھینکا ہے۔ اس کی یاد کرب مجھے اذیت نہیں دیتا۔ اس کا باوقار چہرہ میری نظروں سے ہٹ چکا ہے۔ لیکن کیا سچ مچ ایسا ہی ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ وہ بے مہر دل انسان میرے دل سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو سکتا۔ کاش!۔

صنم افتخار احمد!

ایک نام کے بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ انھوں نے سوچا۔ کیا ضروری ہے کہ یہ وہی شخص ہو۔ اب اس آدمی کے وجود کو دل کی دنیا سے باہر نہیں آنا چاہیئے۔ یہ بھلایا ہوا آدمی پھر سے یاد آ کے نجانے کون سی تباہیاں پھیلائے گا۔ لیکن یہ لڑکی صنم افتخار احمد ـــــ یہ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔؟

وہ کرسی سے اٹھ کر کمرے کی محدود وسعت میں ٹہلنے لگیں۔

اور تبھی وہ قاتل لمحہ آ گیا۔!

"مادام۔ کیا میں اندر آسکتی ہوں۔؟"

وہ جہاں تھیں وہیں جم گئیں۔ مڑ کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ کر سکیں!

آواز پھر سنائی دی لرزتی ہوئی معصوم سی ڈری ڈری آواز ـــ

"مادام! اگر آپ اجازت دیجئے ـــ!"

انھوں نے رخ پھیرا ـــ اور کاسنی رنگ کا پر کشش ہجوم غبار بن کر ان کی آنکھوں کے سامنے چھا گیا! وہی تو تھی حسین اور نازک سی۔ کیا بات تھی اس کے دلفریب چہرے میں کیوں دل کھنچ رہا تھا۔ اس کی طرف ـــ! انھیں اپنی طرف دیکھتا دیکھ کر اس نے لمبی لمبی پلکیں جھکالی تھیں۔

آیئے" بمشکل وہ بول سکیں۔

وہ ڈرتی ڈرتی کمرے میں آئی۔ اور کرسی کی پشت تھام کر کھڑی ہو گئی۔ مس زبیدہ شبیر احمد کا دل طوفان میل بنا ہوا تھا۔ وہ حیران تھیں۔ ایک بالشت بھر کی ننھی سی لڑکی کی موجودگی میں ان کا یہ حال کیوں ہو رہا تھا۔ وہ اس سے کچھ پوچھ نہ سکیں ان سے اسے کیا کام تھا۔ لڑکی خود ہی سے بولی۔

"پرسوں میرا ٹسٹ ہے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔" مگر۔ مم ـــ میرے پاس ـــ" کوشش کر کے مس شبیر احمد نے سنبھالا لیا۔ اور جی کڑا کر کے مسکرائیں۔ "کہو۔ کیا کہنا ہے تمھیں۔؟"

"جی۔ پرسوں میرا ٹسٹ ہے" لڑکی بولی۔ "میرے۔ پاس۔ مکمل نوٹس نہیں ہیں۔ اور کوئی لڑکی اپنے نوٹس دینے پر تیار

نہیں۔ شہلا نے مجھ سے کہا تھا کہ۔ مادام کے پاس جاؤں۔ اور ان سے درخواست کروں۔ وہ ضرور تمہاری مدد کریں گی۔ اسی لئے ہم۔ میں۔ آپ کے پاس آئی ہوں۔ اگر آپ کچھ لکھا سکیں تو۔"

"اچھا۔ اچھا۔ یہ بات ہے۔" وہ شفیق انداز میں مسکرائیں۔ "میں لکھا دوں گی۔ لیکن تم کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

اس نے شاید زیر لب شکریہ ادا کیا تھا۔ اور ٹی۔ وی کے پاس رکھی کرسی کے کنارے پر ٹک گئی۔ سر جھکا لیا۔ اور اپنی کاپی ٹٹولنے لگی۔ گھبراہٹ اس کی ہر حرکت سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"میں ذرا کش لکھوا دوں گی۔" مس شبیر احمد خواہ مخواہ کھانسیں۔ "مگر یہ بتاؤ کہ تم نے ایڈمیشن لینے میں اتنی دیر کیوں کر دی۔ کہیں باہر سے آئی ہو۔"

"جی! پونہ سے۔!"

"پونہ سے؟ وہاں تو بہت سے کالج ہوں گے۔"

جی ہاں بہت سے تھے۔" اس کا انداز گفتگو بہت من موہنا سا تھا۔ "میں نے انٹر وہیں کیا تھا۔ لیکن بی اے میں داخلے کے وقت ابّی نے کہا کہ ہم تمھیں مردانے کالج میں نہیں پڑھائیں گے۔ ابّی یہاں بہت دنوں سے آنا چاہتے تھے۔ پھر ممّی کے انتقال کے بعد وہاں سے ان کا جی اچاٹ ہو گیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ چلو صنم ہم حیدرآباد چلیں۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے دو ہی ہفتے ہوئے ہیں۔"

"بڑا دکھ ہوا یہ سن کر کہ تمہاری ممی ــــ!"

"جی ہاں۔ ممّی بہت بیمار تھیں۔ انھیں گزرے چھ ماہ ہو گئے۔"

اس نے سسکی سی لی۔

"تمہارے اور بہن بھائی تو ہوں گے؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ کوئی نہیں" لڑکی نے جواب دیا۔ "ویسے ابّی کہتے ہیں ان کے کئی عزیز ہیں مگر انھوں نے سب سے قطع تعلق کر دیا۔ بہن بھائی میرا کوئی نہیں۔ چار بھائی تھے وہ سب چھوٹی عمروں میں مر گئے ممّی کو یہی غم تو تھا۔ ہمیشہ روتی رہتی تھیں۔ ان کی بینائی ضائع ہو گئی تھی۔ کچھ اثر دماغ پر بھی ہو گیا تھا مرنے سے پہلے بہکی باتیں کرنے لگی تھیں۔"

"تو اب تم اکیلی ہو ——" "اکیلی نہیں مادام۔ ابّی بھی تو ہیں۔"

"وہ تو تمھیں بہت چاہتے ہوں گے۔؟"

"وہ مجھے چاہتے ہیں یا نہیں۔ معلوم نہیں۔" وہ شرما گئی۔

"کیوں بھئی تمھیں کیوں نہیں معلوم ہے؟" وہ مسکرائیں۔

"جی۔ وہ۔ بس۔ میں کیا بتاؤں۔" لڑکی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "ابّی نے آج تک مجھ سے کہا ہی نہیں کہ انھیں مجھ سے کتنی محبت ہے۔ وہ تو مجھ سے زیادہ باتیں بھی نہیں کرتے۔ بہت خاموش رہتے ہیں۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتی ہوں۔ بتائیے ابّی آپ کیا سوچا کرتے ہیں۔ تو وہ مجھے یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ نہیں بیٹی میں کچھ نہیں سوچتا۔ مگر مادام مجھے پتہ ہے کوئی گہرا دکھ ہے میرے ابّی کو۔ جو وہ مجھے بتانا نہیں چاہتے۔"

"تم لوگ ہمیشہ سے پونہ میں ہو؟" انھوں نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا —— "جی مادام۔"

"تمہارے والد کو معلوم نہیں کہ۔ اس کالج میں بھی لڑکے پڑھتے ہیں" انھوں نے کہا۔
"پتہ نہیں مادام۔ معلوم ہو جائے گا تو مجھے یہاں سے بھی نکلوا دیں گے ا ــــــ" "تمہیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔؟"
"مجھے تو کم ہے۔ ابّی کو زیادہ ہے۔ ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ علم زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرو۔ جہالت بہت بری بات ہے"۔
"خیر۔ ہاں۔ ٹھیک ہے تم کیا لکھنا چاہتی ہو؟"
ابیجی کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیے"۔
انھوں نے میز پر سے ایک کاپی اٹھا کر اسے تھمادی۔ "اس میں مکمل نوٹس ہیں۔ اطمینان سے لکھ کر مجھے کاپی واپس کر دینا۔ جلدی نہیں ہے"۔
"جی۔ بہت اچھا" وہ کھڑی ہو گئی۔ اور سر جھکا کر بولی۔ "بہت شکریہ مادام۔ آپ بہت اچھی ہیں"۔
وہ چلی گئی۔ انھیں پھر اضطراب کے بھنور میں چکراتا چھوڑ گئی ایک بے چینی بے قراری سی۔ دل کے نہ لگنے کا احساس۔ وہ اٹھ کر بستر پر آ لیٹیں۔ اور پھر ساری پچھلی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ پرانا گھر، بھیا، باجی اور سب کوئی۔ جانے کس کی نظر لگی کہ ادھر ادھر بکھر گئے۔ پہلے تو یہ تھا کہ اگر وہ سب کے بیچ میں بیٹھیں تو دکھائی نہ دیتیں۔ اور آج اکیلی ہیں۔ اپنی تمام دل شکن فکروں کے ساتھ۔ یہاں سب ہی اپنے ہیں۔ ماں باپ، بھائی بہن، شوہر اولاد، دوست احباب لیکن کیا ستم ہے کہ کوئی دکھ کو سمجھ نہیں سکتا۔ کسی کے دل میں اتر نہیں

سکتا۔ عجیب سی نفسا نفسی ہے۔ آدمی دوسروں کے دل میں اپنا دل کیونکر ڈال دے۔؟

پھر یکبارگی ان پر اداسی کا دورہ پڑ گیا۔ یہ دنیا اس کی دلچسپیاں، یہ چہل پہل سب ایک دھوکا معلوم ہونے لگی۔ ایک دن اس خرابۂ کائنات کو چھوڑ کے چلے جانا ہے۔ تو پھر اس بے وفا دنیا سے دل کیا لگانا۔ اب ان کا جی تعلیم دینے علم بانٹنے سے بھی بیزار رہنے لگا۔ کلاس لینا ضروری تھا۔ وہ لینے بھی لگیں تھیں لیکن بے دلی سے۔ ان کی بے دلی سب نے بھانپ بھی لی تھی لیکن بھلا کس میں ہمت تھی کہ ان سے ان کی اداسی کی وجہ دریافت کرتا۔ کلاس میں صنم بھی ہوتی تھی۔ اپنے اسی سیدھے سادے انداز میں گم صم سی معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تربیت کسی خاص نہج پر ہوئی تھی۔ کیونکہ کالج میں جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے دوستوں کا جھنڈ تھا۔ وہ ہمیشہ اکیلی ہی دکھائی دیتی تھی۔ کبھی کوئی لڑکی اس کے ساتھ نظر نہیں آئی۔ شاید اس کے باپ نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ کہ وہ سہیلیاں نہ بنائے۔

صنم سے انھیں گہری انسیت ہو گئی تھی۔ کسی وجہ کے بغیر۔ اس لئے کہ اس کے باپ کا نام وہی تھا جو ان کے شوہر کا تھا۔ یہ شاید اس لئے کہ وہ بن ماں کی بچّی تھی۔ اس کا باپ اسے اس طرح نہیں چاہتا تھا جس کی وہ حقدار تھی۔

ایک دوپہر لنچ کے وقت وہ دربار ہال سے گزریں۔ سب طلباء ڈائننگ ہال میں تھے۔ کالج تقریباً سنسان تھا۔ اکیلی صنم ایک ستون سے لگی بیٹھی دکھائی دی۔ مس شبنم ڈنکھلہ نے حیرت سے اسے دیکھا وہ اٹھ کر کھڑی

ہو گئی۔ "تم لنچ کے لئے نہیں گئیں۔؟"

"جی نہیں مادام۔" وہ شرمسار سی ہو رہی تھی۔ "ابھی تک ڈرائیور لنچ نہیں لایا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔؟"

"خیر وہ لائے نہ لائے تم میرے ساتھ چلو۔" انھوں نے کہا۔

"جی مادام شکریہ۔" —— "بھئی شکریہ کس بات کا۔ آؤ چلو میرے ساتھ۔" —— "پتہ نہیں مادام ابی کیا کہیں۔ انھوں نے منع کر دیا تھا کسی سے زیادہ گھلنا ملنا نہیں۔"

"تمھارے ابی سے کہنے کون جا رہا ہے عجیب ہیں تمھارے ابی بھلا آؤ۔" وہ انکار کرتی رہی لیکن مس شبیر احمد اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔ وہ مجبوب بنی جھجک رہی تھی۔ انھوں نے اسے باتوں میں لگا لیا۔

"تم نے ایڈمیشن لینے میں بڑی دیر کر دی ہے۔ کلاس کے بعد چلی آیا کرو میں تمھیں نوٹس لکھا دیا کروں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے کالج کی کوئی لڑکی فیل ہو جائے۔ اور کالج کی نیک نامی اور شہرت میں فرق آئے۔"

"جی۔"

ملازمہ نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔ وہ اسے میز تک لے آئیں اور کندھوں سے تھام کر کرسی پر بیٹھا دیا۔ کھانے کے دوران میں صنم نے کہا۔ "مادام میں ایک بات آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔ آپ ناراض تو نہیں ہوں گی۔ کتنے دنوں سے یہی سوچ رہی ہوں کہ کہوں کہ نہ کہوں۔"

"ضرور کہو۔ تم نے دم کے کباب تو لئے ہی نہیں۔"

"جی لیتی ہوں۔" اس نے رکتے ہوئے کہا۔ "مادام۔ میں نے آپ

کی مہربانیوں اور توجہ کا ذکر ابّی سے کیا تھا۔ وہ بہت خوش ہونے لگے کہنے لگے کہ۔ اپنی مادام کو ایک دن گھر لاؤ۔ ان کی دعوت کرو۔ مادام اگر میں آپ کی دعوت کروں تو کیا آپ ہمارے گھر آئیں گی۔"

افتخار احمد کہیں تم وہی بیس سال والے ظالم نکلے تو پھر۔ ان کا دل دھڑک اٹھا۔

"نہیں صنم یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں کسی کے گھر نہیں جاتی"

"مادام۔ اگر کوئی آپ کو۔ آپ کو۔ بہت چاہتا ہو۔ تب بھی آپ اس کے گھر نہیں جائیں گی۔؟"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"ہاں۔ مادام۔ صنم کے کپکپاتے لبوں پر جھینپی سی مسکراہٹ بکھر گئی "مم۔ میں آپ کو بہت چاہتی ہوں۔ پہلی دفعہ جب میں نے آپ کو دیکھا تھا تبھی آپ مجھے اتنی اچھی لگی تھیں! میں نے سوچ لیا تھا کہ میں آپ کو بہت چاہوں گی۔ اور چاہنے لگی۔

"شکریہ۔" انھوں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "میرے اکثر طالبات مجھے بہت چاہتے ہیں۔ استاد اور شاگرد میں محبت ضرور ہونی چاہئیے۔ علم کا رشتہ بہت مقدس ہوتا ہے۔ تم کھانے کے بعد کیا پیتی ہو۔؟ چائے یا کافی۔"

"کچھ بھی نہیں مادام۔" اس کا روشن چہرہ تاریک ہوگیا۔

مس شبیر احمد کے لبوں تک آکے رہ گیا کہ وہ اس کے دادا۔ بڑے چچا اور پھوپھیوں کے نام پوچھیں۔ کم سے کم ماں کا نام پوچھ لیں۔ لیکن اُن کی زبان نہ الٹ سکی۔ کیا سوچے گی یہ لڑکی۔ اس کی ذات

ہیں کیوں دلچسپی لے رہی تھیں۔ وہ سب میں کہتی پھرے گی ان کی
سنجیدگی بہادر اور بڑھ جائے گی۔ اور خود یہ لڑکی اپنے باپ سے کہے
گی پاپا مسز ان کے رشتے داروں کے نام پوچھ رہی تھیں۔ کہیں وہ حضرت
دوسرے شکیب نہ ثابت ہوں کہ آہ بھار لگا دیں۔ بیٹی کی وساطت سے
دعوت تو دے ہی ڈالی ہے۔ نہیں زیادہ بے تکلفی اچھی نہیں۔ وہ محتاط
ہو گئیں۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ خادمہ کافی لائی۔ تب صنم نے پوچھا۔
"پھر آپ نے کوئی نہیں مادام، کیا شبیر کی خاطر بھی اپنا اصول توڑ نہیں
سکتیں۔ ایک دفعہ آیئے نا مادام۔ آپ کو معلوم نہیں۔ بہت قریب
ہے ہمارا۔ اگر آپ ناول کے درختوں کا وہ جھنڈ دیکھ رہی ہیں۔ بس
اُس جھنڈ کے پیچھے سبز نیلی کوٹھی ہے۔ ابا نے خرید لی ہے کوٹھی۔"

یہ بہت زیادہ بے باک ہو رہی ہے۔ اس کی زبان کھل چکی تھی
معاملہ اور شبیر کے درمیان ہے نکاح اچھی بات نہیں۔ انہوں نے نفی
میں سر ہلا دیا۔ "نہیں میں کسی کے گھر نہیں جاتی۔ آئندہ مجھ سے
اصرار نہ کرنا۔"

"جی۔" وہ یکبارگی خاموش ہو گئی۔

پھر رہائش کا چپراسی آیا۔ اور مودبانہ عرض کی۔ صنم کا...
ڈرائیور آیا تھا۔ "اجازت دیجئے مادام۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"اچھا۔ خوش رہو کہ کامیاب ہوں تو شبیر کو ذرا تلاش لیتی آنا۔" وہ پھر سے کھردری
بن گئیں ...... "جی بہت اچھا۔" وسیم نے کہا۔ پھر جھک کر سلام
کیا پھر الٹے قدموں چل کر دروازے سے نکل گئی۔ مسز شبیر احمد
نے اپنا گمشدہ قرار تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہیں۔

کیوں کھو گیا تھا سکھ چین۔ ان کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ ایک نئی اجنبی لڑکی
سے محبت کیا دلچسپی کیسی اگر اس کا سرنیم افتخار احمد ہو تو بھی۔ انھیں یاد آیا کہ
ایم۔ اے میں خود ان کے دو طالب علم اسی نام کے تھے۔ کوئی دنیا سے عجوبہ
نام نہ تھا۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ اس نے دفعتاً کالج آنا بند کر دیا۔ روز
حاضری کے وقت نام اور نمبر کی ہانک لگانے سے پہلے ان کی نگاہیں ان
لڑکیوں کی طرف اٹھ جاتیں جن کے پاس وہ بیٹھا کرتی تھی۔ لیکن ان میں
اسے نہ پا کر ان کا دل ڈوب جاتا۔ کیا بات تھی۔ کیوں غیر حاضر تھی۔ کسی سے
پوچھتے سبکی محسوس ہوتی۔ ان کی متانت اور وقار کے منافی تھی یہ بات
وہ کلاس میں لیکچر دیتیں۔ مگر زبان ذہن کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔

پھر ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور مس شبیر احمد کی بے چینی بڑھ گئی۔ انھیں
خود بھی حیرت تھی کہ آخر ایسا کیوں تھا۔ انھوں نے اپنے اضطراب کو کم کرنے
کے لئے سوچا تھا کہ شائستہ یا شبنم کو ساری بات بتا دیں گی۔ شاید وہ
کوئی حل نکالتیں لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتی تھیں کہ
ماضی کو زندگی نے دفن کر دیا ہے۔ پھر ان کی دانست میں زندہ ہو جاتا۔
پھر ایک دن حاضری لیتے ہوئے انھوں نے جان بوجھ کر سرسری
انداز میں پوچھا۔ "کیا بات ہے نمبر بائیس کیوں مسلسل غیر حاضر ہے۔
ذہین لڑکی تھی۔ کیا نکل گئی کالج سے؟"

"جی مادام۔ نکلی نہیں۔" شہلا بولی۔ "میں گئی تھی اس کے گھر۔ یہی
پوچھنے کے لئے کہ کیوں نہیں آ رہی ہے معلوم ہوا کہ اس کے والد صاحب
کی طبیعت بہت خراب تھی۔ میں جب گئی تھی تب بھی دو دو ڈاکٹر ان کے
پاس بیٹھے تھے۔

کیا ہوا ہے۔ اس کے والد صاحب کو۔" ان کا دل پھر ڈوبنے لگا۔ اور خنکی کی ایک لہر سی سارے بدن میں دوڑ گئی۔

"مادام، صنم کہہ رہی تھی کہ کسی نامعلوم مرض کے دورے پڑتے ہیں۔۔۔ بے چارے چار چار گھنٹے بیہوش پڑے رہتے ہیں۔"

"تو وہ اب کالج آئے گی کہ نہیں!"

"یہ تو میں نے نہیں پوچھا مادام۔!"

"خیر ہاں۔ تو۔ آج ایک صحافی کے پیشے اور بنیادی اصول پر لیکچر دینا ہے" پھر انھوں نے کیا پڑھایا تھا کیا کہا تھا۔ ان کی خود سمجھ میں نہیں آیا۔ انھوں نے اپنا دوسرا گھنٹہ مسز فاخرہ کو دے دیا اور خود گھر چلی گئیں۔ یہاں شائستہ اور شبنم موجود تھیں۔ جانے کب آ گئی تھیں۔

"خیریت" شائستہ نے کہا۔ "آج اس وقت کیسے۔ کلاسیں نہیں ہیں۔"

"طبیعت گری گری سی ہے۔" وہ صوفے پر گریں۔ "اب کچھ جی نہیں لگ رہا۔ مگر آپ دونوں بھی اس وقت کیسے آئی ہیں۔ شبنم تم اسپتال نہیں گئیں۔" ——— "شام کو جانا ہے۔ اچھا ہوا ہے نا کر آ گئی ہوں تمھیں دیکھ لوں گی۔ ادھر دو اپنی نبض۔" شبنم نے کہا۔ اور ان کے پہلو میں گھس کر بیٹھ گئیں۔ نبض تھام لی۔ مگر زبیدہ نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تختہ مشق بننا نہیں چاہتی۔"

"میں کچھ کہتی ہوں تو تم کان نہیں دھرتیں۔" شائستہ نے کہا۔ "ذرا سنجیدگی سے سوچو آخر۔ شکیب صاحب میں برائی کیا ہے۔ پچھلی شام وہ رہنما صاحب کا پتہ معلوم کر کے ان کے پاس پہونچ گئے تھے۔ اور اپنی داستان سنا کر استدعا کر رہے تھے کہ مس شبیر احمد کو راضی کر دیجیے۔"

"باجی سنئے۔" زبیدہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "اگر آپ لوگوں نے اس سلسلے میں مجھ پر زور دیا تو خدا کی قسم میں کہیں چلی جاؤں گی۔ میرا ایک دفعہ اور باہر جانے کا چانس محفوظ ہے۔ سمجھا آپ نے۔ کیا مصیبت ہے کہ بیس سال دماغی جسمانی روحانی اور قلبی اذیتیں برداشت کر کے اب سکون ہوا ہے تو بھی کوئی جینے نہیں دیتا۔ مجھے کبھی شادی نہیں کرنی ہے۔ اتنی سی بات بھی آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ مجھے اس شخص نے اپنے نکاح سے آزاد کہاں کیا ہے؟"

"تم سے زیادہ جانتے ہیں ہم!" شائستہ نے جواب دیا۔ "اگر چار پانچ سال تک میاں بیوی الگ رہیں تو طلاق خود بخود پڑ جاتی ہے۔"

"کچھ بھی ہو" زبیدہ نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ دیا کہ اگر اب کی شکیب صاحب نے یہاں قدم رکھا یا آپ کے یہاں جا کے گھگھیائے تو کوئی نہ کوئی الزام رکھ کر ان کو پولیس کے حوالے کر دوں گی۔"

"آپا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" شبنم نے پوچھا۔

"ارے اس فلمی انداز میں مت پوچھو بھائی!" وہ ہنس دیں۔ "اپنا آخری اور قطعی فیصلہ میں پچاس دفعہ سنا چکی ہوں۔"

"پھر یہ طبیعت کی خرابی ۔۔۔!" شبنم نے ہنس کر کہا۔

"بکواس کرتے کرتے دماغ گول ہو جاتا ہے۔"

"خیر تم جانو۔ اب کی شکیب صاحب آئیں گے تو صاف جواب سنا دیا جائے گا۔" شائستہ نے کہا۔ "مگر آپا۔ تمہاری زندگی کا کوئی نہ کوئی نصب العین تو ہونا ہی چاہیئے۔" شبنم نے کہا۔

"خدا کے واسطے مجھے نصب العین کے بغیر ہی زندہ رہنے دو!"

زبیدہ نے زچ ہو کر اپنا سر تھام لیا۔ "یا تو پھر میں کہیں دفعہ ہو جاؤں۔ جیسے بھی ہو"

"ختم کرو شبنم۔ سچ ہے بار بار دوسروں کی مرضی کے بغیر کسی بڑی بات پر مجبور کرنا اچھا نہیں۔ انہیں حق ہے اپنی مرضی سے جینے کا۔" شائستہ نے کہا۔ پھر زبیدہ سے بولیں "فکر نہ کرنا۔ اب یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ خدا تمہیں سکون و مسرت عطا کرے۔

کبھی کبھی سیر و تفریح کے لئے بھی جایا کرو آپا۔ دن رات دماغ پاشی کرتی ہو۔" شبنم نے کہا۔ "کتنا کہا کہ ہمارے ہاں چل کے رہو۔ وہاں بچے ہیں۔ ان کی کمپنی میں جی لگ جایا کرے گا۔

"ہاں! آؤں گی کبھی" زبیدہ نے کہا۔ "باجی آپ کے جانے کا کیا ہوا۔؟ ـــــ "دن کم رہ گئے ہیں۔" شائستہ نے کہا۔ "میرا تو جی ہول جاتا ہے۔ جو باہر گیا بس ادھر ہی کا ہو کے رہ گیا۔ اب جا رہے گئے معلوم نہیں، پھر کب آنا ہو گا۔"

"جہاں جو بھی رہے خوش رہے بس۔" شبنم نے کہا۔

"لاکھ کچھ ہو۔ اپنے وطن کی بات نہیں آتی۔" زبیدہ نے کہا۔ وطن کا ذرہ ذرہ اپنا ہوتا ہے۔ ماحول مانوس، سڑکیں، گلیاں، محل، جھونپڑے، در و دیوار انسان سب اپنے لگتے ہیں۔ مگر باہر جا کے انسان دولت بنانے کی مشین ہو ڈھل جاتا ہے۔ اس کا مطمح نظر صرف پیسہ کمانا ہوتا ہے۔ اسی کی خاطر وہ وطن سے اپنوں سے سارے جذباتی ناطے توڑ کے جاتا ہے۔ پھر ان ناطوں پر پیسے کا اثر غالب آتا ہے غائیرت کا احساس، اجنبی پن، جذبوں کا فقدان عجیب سی نفرت

ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی پانچ سال باہر گزارے تھے۔ مگر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ وطن کی یاد دل سے نکلی ہو۔"

"کیا کریں بی بی"۔ شائستہ نے کہا۔ "زمانہ ترقی کے گھوڑے پر سوار بھاگ رہا ہے۔ آمدنی کم ہے خرچ زیادہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ خدا نے اولاد دی ہے۔ ان کی پرورش، دکھ سکھ تہوار تعلیم، ملبوسات ضروری ہیں۔ کیا کیا جائے۔ غیر ملک کی بھیک لئے گزارہ ہی نہیں۔ جی تو نہیں چاہتا۔ یہ تو اچھا خاصا ہاتھ پسارنا ہوا۔

"اب دیکھئے کہ بھیا امریکہ ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں"۔ شبنم نے کہا۔

"یہ اور بات ہے کہ ان کا معیار زندگی بہت بلند ہو چکا ہے۔ بچے بہت اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن سب عزیزوں سے کٹ کر رہ گئے رشتوں پر اثر پڑا ہے۔ کوئی کسی کو نہیں چاہتا۔ دکھ سکھ میں مرنے جینے میں ایک دوسرے کی صورتوں کو ترس جاتے ہیں۔ مجھ سے بھی شبیر صاحب نے کہا تھا کہ باہر ان کا اسکوپ بہت ہے۔ لاکھوں کما لیتے ہیں۔ میں راضی نہیں ہوئی۔ وطن کی دال روٹی باہر کے قورمہ پلاؤ سے اچھی ہے۔"

رات کا کھانا کھا کے شائستہ اور شبنم سو رہیں۔ لیکن زبیدہ کو یکسوئی عطا کر گئیں۔ شکیب صاحب کا کانٹا نکلا۔

چاندنی رات تھی۔ انھوں نے دریچہ کھولا۔ کالج کے باغ میں تیز چاندنی اس طرح کھلی ہوئی تھی جیسے کہ دن نکل آیا ہو۔ دور پر ناریل کے جھنڈ کھڑے تھے۔ چاندنی میں ان کا ایک ایک پتہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دفعتہً ان کے ذہن میں آواز گونجی۔

ناریل کے جھنڈ کے پیچھے نیلی کوٹھی۔ ادہی تو اس لڑکی کا گھر تھا۔ ان کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ یہاں وہاں سناٹا تھا۔ کالج ایریا رات کے دس بجے قطعی سنسان ہو جاتا تھا۔ اگر وہاں کا ایک چکر لگا دیں تو۔ انھوں نے جھک کر جھانکا۔ باغبان کا دروازہ بند تھا۔ پچھلے زینوں سے لے کر روش تک اور روش سے گیٹ اور دور سڑک تک ہر چیز روشن اور منور تھی۔

انھوں نے غیر ارادی طور پر کرسی پر پڑی خوشنما شال اوڑھ لی۔ اور دریچہ بند کر کے زینوں کے سروں پر آکھڑی ہوئیں۔ ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔

اگر کسی نے دیکھ لیا۔ تب کیا ہوگا۔ بات کا بتنگڑ رائی کا پہاڑ بنتے دیر کیا لگتی ہے۔ اتنے بڑے کالج کی معزز پرنسپل آدھی رات کو تنہا سڑکوں پر گھومتی دیکھی گئیں۔ ایک دفعہ ماتھے پر کالک لگ جائے تو مشکل سے چھوٹتی ہے۔ مگر اس میں حرج ہی کیا ہے چہل قدمی گناہ نہیں۔ چاندنی رات میں لطف اٹھانا بھی جرم نہیں۔ یہ تو دل کا چور ڈر رہا تھا۔ اگر نیت صاف ہو تو خوف کس بات کا۔

انھوں نے کندھوں کے گرد شال اچھی طرح لپیٹی اور نیچے اتر میں دل دھڑک رہا تھا۔ پاؤں کانپ رہے تھے لیکن وہ جلدی جلدی روش عبور کر کے پھاٹک تک آ پہنچیں۔ اسے کھولا۔ دور و نزدیک روشن سناٹا کچھ بولتا ہوا لگ رہا تھا۔ ہر طرف عجیب سی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ ان کی ہمت بندھی اور انھوں نے قدم تیز کر دیئے۔ پھر ناریل کا وہ جھنڈ جو دور سے خاموش معلوم ہو رہا تھا۔ یک بیک بولنے

دنگا۔ ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ اور درختوں کے پتے عجیب انداز میں ہل رہے تھے۔ سناٹے میں وہ آوازیں خوفناک لگ رہی تھیں۔
مسز شبیر احمد ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئیں۔

کون سا جذبہ انھیں یہاں تک لایا تھا۔ آتنی رات گئے۔ کیا سوچ کے چلی تھیں۔ کیا وہ نیلی کوٹھی کے دروازے پر دستک دے سکتی تھیں کیا صنم سے پوچھ سکتی تھیں کہ اس کے والد کا اب کیا حال تھا؟ کیا وہ اس کی متحیر و متعجب نظروں کا مقابلہ کر سکتی تھیں؟

نہیں۔ بالکل نہیں۔ ابھی نیلی کوٹھی دکھائی نہیں دی۔ اس کے در پر دستک نہیں دی۔ جذبے شتر بے مہار ہوتے ہیں۔ ضد کرتے ہیں۔
انھوں نے سڑک پر دوڑنا شروع کیا۔ جلد ہی اپنے باغ تک پہنچ گئیں۔ اور ہانپتی ہوئی سانسوں کو قابو میں کرنے کے لئے ستون پر سر رکھ دیا۔ محبت کی یہ قسم سب سے خطرناک ہے۔ ان کے دماغ نے ملامت کی ۔۔۔ لیکن کیا تم صرف صنم ہی خاطر یہاں تک دوڑ کے آئی تھیں؟ دل نے طنز کیا۔

آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔ انھوں نے سر اٹھایا دیکھا کہ گرد و پیش سناٹا تھا۔ صرف چاندنی کا جادو تھا۔ جو کائنات پر محیط تھا۔ بہکا ہوا ماحول تھا اور بہکا ہوا ان کا وجود تھا۔
اپنی بے خبطی بے قراری اور بے بسی پر ان کے آنسو بہنے لگے۔ کچھ دیر تک عجیب سی کسمپرسی کے عالم میں روتا کیں۔ جب دل کا غبار آنسوؤں میں کر بہہ گیا۔ تب انھوں نے گیٹ کی روک کھولی۔ اور روشوں پر سے ہوتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئیں۔ نرم شال اتار کر الگ پھینکی

— ہیٹر آن کیا۔ اور بستر پر گر پڑیں۔ پھر کروٹیں بدلتے بدلتے صبح ہو گئی۔ وہ صبح ان کی بے قراریوں کو قرار میں بدلنے والی ثابت ہوئی۔

دس روز بعد انھوں نے کلاس میں صنم کو دیکھا تھا عجیب سی ویران لگ رہی تھی۔ دُکھی مغموم اور گم صم سی۔ جیسے بہت روتی ہو۔ اور کسی نے آنسو نہ پونچھے ہوں مس شبیر احمد کا دل بیٹھ گیا۔ کیسے پوچھیں کیا پوچھیں وہ تو سب کے لئے چٹان تھیں۔ اور چٹان ہی رہنا چاہتی تھیں۔ ان کی مزاج پرسی سب کے لئے حیران کن ہوگی۔ اور وہ یہ گوارہ نہ کر سکتی تھیں کہ ان کے پیٹھ پیچھے کوئی ان پر ہنسے یا مسکرائے۔

صنم کی شکل پر نظر پڑی تب ان کے دل و دماغ میں ایک سرد سا سکون اتر آیا۔ انھوں نے اطمینان سے کلاسیں لیں اور صنم سے کچھ پوچھے بغیر اپنے گھر کی طرف چل پڑیں۔

سہ پہر کو خادمہ نے کسی کے آمد کی خبر دی۔

"کوئی صاحب ہیں کیا۔؟"

"جی بی بی۔ وہی بچی ہے۔"

"بھیج دو یہاں۔"

پردہ سرکا اور صنم کا چہرہ دکھائی دیا۔ انھوں نے سوچا تھا کہ وہ بناوٹی انداز میں مسکرائیں گی۔ مگر ان کی مسکراہٹ خود بخود خالص بن گئی۔

"او ہو۔ بہت دنوں بعد دکھائی دی ہو۔ خیریت تو ہے۔ بھئی اس طرح ناغے کرو گی تو کلاس میں بہت پیچھے رہ جاؤ گی۔"

صنم یکبارگی رونے لگی۔ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں اب کالج نہیں آسکتی مادام ۔۔۔!"

"کیوں ۔۔!" ان کے وجود میں کوئی چیز ٹوٹ کے بکھر گئی۔

"امی اب بھی بیمار ہیں۔" ہچکیوں اور سسکیوں میں اس نے بتایا۔ "ہفتہ بھر پہلے ان کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا۔ اگر اچھے ہو گئے تو ان کی قسمت۔ ورنہ۔ پھر میں امی کے لئے دن رات دعائیں مانگتی تھی۔ میری دعائیں خدا نے سن لیں وہ کچھ ٹھیک ہو گئے۔ مگر انھیں صحت مند نہیں کہا جا سکتا۔ اب وہ دہشت زدہ ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ اگر خدانخواستہ انھیں کچھ ہو گیا۔ تو۔ میں۔ میرا کیا ہو گا۔ وہ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں ۔۔۔!"

ہچکی نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔

"وہ صنم کیا کہتے ہیں وہ!" مس شبیر احمد اٹھیں۔ اسے ٹھنڈا پانی پلایا۔ ہاتھ بھگو کر اس کے چہرے پر پونچھا۔ اور تسلیاں دیں۔ ملازمہ سے اس کے لئے کافی منگوائی۔ جب ایک آدھ گھنٹے بعد صنم سنبھلی تو پھر بولی!

"مادام! امی اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر میرا کوئی سہارا نہ رہے گا!" اس کی سسکیاں جاری تھیں "اسی لئے وہ میری تعلیم ضروری نہیں سمجھتے اور میری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ کوئی تو سہارا ہو میرا۔" اس نے ہچکی سی لی اور سر جھکا لیا۔

"رومت صنم! چپ ہو جاؤ۔ انھوں نے بے اختیار ہو کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔" آنسو کسی مسئلے کا حل نہیں بیٹی!

آنسو درد بڑھا دیتے ہیں۔ بے چارگی کا احساس دلاتے ہیں۔ آنسو کسی مرض کی دوا نہیں ہو سکتے ہیں تم ٹھنڈے دل سے سوچو کہ تم خود کیا چاہتی ہو۔ خود کو بے سہارا مت سمجھو!۔ انسان کبھی انسان کا سہارا نہیں ہوتا بچی۔ سب سے بڑا سہارا تو خدا ہے۔"

"مادام خدا ہی تو یہ سب کچھ کر رہا ہے۔" وہ باغی ہو رہی تھی۔

"وہی مصائب کے بادلوں کو بکھیر بھی دے گا۔ تم اگر میری زندگی کی کہانی سنو۔" کچھ کہتے کہتے انھوں نے زبان تھام لی۔ "ہاں۔ میری طرف سے تم اپنے والد صاحب کو سمجھانا کہ تمھاری تعلیم بہت اہم ہے۔ بہت ضروری ہے۔ بیٹی کا جاہل کہلانا بہت بری بات ہے۔ یہ کلنک زندگی بھر ذات سے نہیں چھوٹتا کیا تمھارے ننھیال، ددھیال میں کوئی ایسا نہیں جو تمھارا خبر گیراں ہو!"

"ننھیال کا تو مجھے پتہ ہی نہیں مادام۔!" صنم نے کہا۔ ان کی دلداری سے وہ کچھ نارمل سی نظر آنے لگی تھی۔ استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولی۔ "اور ابّی کہتے ہیں کہ خبردار ددھیال کا نام نہ لو۔ وہ سب میرے نانا ابا، پھوپھیاں، اور جانے کون کون سب ہمارے لئے مر چکے ہیں۔"

"کیوں کہتے ہیں ایسا؟"

"معلوم نہیں مادام۔ میں اتنی بڑی ہو چکی ہوں۔ مگر سچ مانئے کہ میں اپنے نانا اور دادا کے سارے ہی عزیزوں سے بے خبر ہوں۔ اگر آج کوئی آ کے میرے سامنے کھڑا ہو جائے کہ میں تمھارا فلاں رشتہ دار ہوں تو میں اسے پہچان نہیں سکتی۔"

"خیریت ہے کیا کسی جاگیر یا وراثت کے مسئلے پر یہ جانی دشمنی آ کے پڑی ہے۔"

"معلوم نہیں مادام۔" وہ عجیب سی معصوم ہو رہی تھی۔
"تمھیں اپنے نانا یا دادا کے نام تو معلوم ہوں گے۔"؟
"میں نے ہوش سنبھالا تھا تو ابی سے پوچھا تھا۔ وہ خفا ہونے لگے۔ ابی کی خفگی میں برداشت نہیں کر سکتی۔"
"تمھاری امی کا نام کیا تھا۔؟"
"سیدہ زہرہ جمال۔"
مس شبیر احمد کی امیدوں کا محل دھڑام سے گر گیا۔ کاش یہ کہہ دیتی کہ اس کی ماں کا نام سفینہ تھا۔ تب تو شاید وہ شادی مرگ ہو جاتیں۔
"بیٹی تمھیں کبھی کسی نے نینا کہہ کے نہیں پکارا۔" مردہ آواز میں انھوں نے پوچھا۔ اور خود اپنی ہی حماقت پر خجل سی ہو گئیں۔ نینا دو ماہ کی تھی جب وہ کھو گئی۔ اسے یا افتخار کو اس کے نام کی کیا خبر ہو سکتی۔
"نہیں مادام میرا نام صنم ہی ہے۔ ہاں۔ اصلی نام میرا سکینہ جمال ہے۔ ابی نے صنم کہنا شروع کیا۔ کہتے تھے کہ یہ نام اہلبیت اطہار میں سے ایک مقدس نام ہے اسے برکت کے طور پر رکھ تو سکتے ہیں مگر بار بار زبان سے ادا کر کے بے ادبی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔"
"اس طرح تمھاری امی کا نام بھی کچھ اور ہو سکتا ہے۔"
"پتہ نہیں مادام!" اس نے کہا۔ پھر حیرت سے بولی۔ "مگر یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔ میری امی کیا کبھی آپ کی دوست رہی تھیں۔"
انھیں ہوش آ گیا جلدی سے بولیں۔ "نہیں بیٹی۔ بات یہ ہے کہ تمھارے ان حالات کو سن کر میں نے پوچھا تھا۔ کہ تمھارے نانا یا دادا کے عزیزوں میں تو کوئی ایسا نہیں جو تمھارا سرپرست ثابت ہوتا۔ انھیں گھبرا کر بہانہ بنانا بھی نہیں آیا۔
صنم نے نفی میں سر ہلایا پھر بولی۔ "مادام مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ سے آخری دفعہ ملنے آئی ہوں۔ میرا دل دکھ رہا ہے مادام۔ آپ سے میں پھر کبھی نہیں مل سکتی۔ آپ کتنی اچھی ہیں۔ آپ نے مجھ سے کتنی محبت کی ہے۔

یہاں اور بھی تو ٹیچرز ہیں کسی کی طرف میرا دل نہیں کھنچتا! آپ کے پاس آتی
ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ۔ جیسے۔ جیسے میں اپنی ماں کے پاس آ گئی
ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیئے گا مادام۔ میں اتنی بے حقیقت ہو کر۔ آپ سے یہ رشتہ
جوڑ رہی ہوں۔ مجھے آپ سے بہت محبت ہے۔ مادام۔ آپ اتنی اچھی ہیں۔
مادام۔" وہ یکبارگی رو پڑی۔ "میرے اور ابی کے حق میں یہی دعا کیجیئے گا کہ
ہم دونوں ساتھ ساتھ مر جائیں۔ میں ابھی ابی کو چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتی"

آنسو مس شبیر احمد کی حلق میں ہجوم کر آئے۔ وہ دیر تک خاموش رہیں
صنم روتی رہی پھر وہ سنبھلی اور ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اجازت دیجیئے مادام" وہ عجیب انداز میں مسکرائی۔ "میں چلتی ہوں مادام۔
میں زندگی بھر آپ کو نہیں بھول سکتی۔"

صنم چلی گئی۔ اور انھیں ایک اندھے کنوئیں میں جھونک گئی۔ ہزار سوچنے
پر بھی ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ اس کے لئے کیا کر سکتی تھیں۔ انھوں نے
اپنے بہن بھائی اور شبنم سے صنم کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ کون سی اہم بات تھی
اب بھی ذکر کرنے سے کیا حاصل تھا۔ کیا کوئی صنم اور اس کے سخت گیر
باپ کے ذاتی معاملے میں لب کشائی کر سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ سوچتی اور
خون جلاتی رہیں۔ صنم نے اپنی زبان سے جو کچھ کہا تھا۔ وہی تو ان کا دل بھی کہتا تھا

شام بے حد اداس تھی۔ سناٹا آج کچھ زیادہ ہی گہرا ہو رہا تھا۔ یا یہ ان کے
دل کا سناٹا تھا۔ بے دلی سے انھوں نے کافی پی اور اپنی خاص کرسی پر
آ بیٹھیں۔ بڑی کھڑکی کے پردے دور تک ہٹا دیئے۔ ان کی نظروں کے سامنے
بھیگا ہوا باغ تھا۔ بلند اور اونچے درخت نئی اور چمکیلی سرسبز قبا پہنے سر
اٹھائے کھڑے تھے۔ بارش نے پودوں کو نرگسوں اور پھولوں کو پامال کیا تھا۔

سبزہ بھیگا ہوا تھا۔ چنبیلی کے منڈوے پر پھیکے بے رنگ پھول چپکے ہوئے تھے۔ کچھ فرش زمین پر پڑے تھے۔

چند ساعتوں کی مسکراہٹوں کا یہ انجام ـــــ ایک تلخ تبسم ان کے لبوں پر بکھر گیا۔ میری زندگی بھی ایسی ہی ہے۔

تبھی ان کی خاص خادمہ اندر آئی۔

"کوئی صاحب آئے ہیں بی بی۔"

"وہی پرانے صاحب ان سے کہہ دو کہ ـــــ!"

"یہ کوئی دوسرے ہیں بی بی۔ کوئی پچاس پچپن کے اندر ہوں گے۔ دکھیاروں کا سا چہرہ سر کے آدھے بال سفید۔ اور ــ اور ـــــ!" ملازمہ مکمل حلیہ بتانے پر آمادہ تھی۔ انھوں نے اسے روک دیا۔

"پوچھ کے آؤ کیا کام ہے کس سے ملنا ہے۔ چلے آتے ہیں سیدھے میرے ہی گھر پر۔ شبنم سچ ہی کہتی تھی۔ اکیلے رہنا مصیبت مول لینا ہے۔"

ملازمہ ایک منٹ بعد ہی واپس آ گئی۔ "جی۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"میں اس طرف بیٹھی ہوں۔ تم انھیں ڈرائنگ روم میں لے آؤ۔" اٹھتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "کچھ دیر بعد سینڈوچز، بادام اور کافی پہنچا دینا۔"

"جی۔ بہت اچھا۔" ملازمہ نے جاتے جاتے دونوں مرکری بٹن آن کر دئے۔ وہ نسبتاً سائے میں تھیں۔ آہنی الماری کا سایہ انہی پر پڑ رہا تھا وہ جان بوجھ کر کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھیں تکذیب کی جسارت کے بعد انھیں کافی محتاط رہنا پڑتا تھا۔

انھوں نے آڑ ہی سے نووارد پر نظر ڈالی۔ اور سرد ہو کر رہ گئیں یکبارگی

جیسے پوری دنیا قلابازی کھا گئی ہو۔ انھوں نے چکراتی ہوئی آنکھوں کو بڑی مشکل سے قابو میں کیا۔ اور خود کو زمین پر گرنے سے روکا۔

"آداب عرض کرتا ہوں محترمہ!" ان نووارد صاحب نے بڑے ادب سے سلام کیا۔ اور اس طرف نظریں اٹھائے بغیر کسی قدر پیٹھ موڑ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

مس زبیدہ شبیر احمد کا جسم آندھیوں میں آئے ہوئے کمزور درخت کی طرح کانپ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی لہریے اور دائرے سے بن رہے تھے۔ بگڑ رہے تھے۔ ان کے سر سے لے کر پاؤں تک ٹھنڈے پسینے کے سنپولئے رینگ رہے تھے۔

نووارد صاحب کی بھاری آواز کچھ رکی سی کچھ اداس سی بڑی دور سے زبیدہ کے کانوں میں آئی۔

"معاف کیجئے گا۔ میں نے شاید آپ کو زحمت دی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میری بچی نے آپ کا پیغام مجھ تک پہنچایا تھا۔ اور آپ کی اتنی تعریفیں کی تھیں۔ کہ۔ دراصل مجھے اسی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ آپ کی بے حد مداح ہے۔ آپ کی باتیں کرتی نہیں تھکتی۔ آپ نے اسے اتنی توجہ دی ہے۔ اس سے بڑی مہربانی سے پیش آتی ہیں۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ۔ ابی آپ جایئے اور میری مادام کا بہت سا شکریہ ادا کر آیئے۔ آپ غالباً" مجھ سے کچھ فرمانا بھی چاہتی تھیں"۔

وہ چپ ہو کر خفیف سا ہنسے تھے۔ اور مادام کے جواب کا انتظار کرنے لگے ——— "صنم میری بچی ہے۔ میری ننیا" ہزاروں چیخیں زبیدہ کے حلق میں مچل رہی تھیں۔ دہاڑ مارنے کے لئے۔ بے چین تھیں ننیا کو سینے سے لگا لینے کے لئے۔ انھوں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا تھا بیس سال بعد۔ زندگی کا یہ موڑ۔ اف خدایا۔

دو تین لمحے صدیاں بن کر ان پر سے گزرے۔ پھر نووارد صاحب نے کہا۔
"آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھیں۔ صنم کے بارے میں۔ فرمایئے؟"

وہی دلکش آواز ہے وہی پرکشش لب و لہجہ۔ اور وہی ظالم ہنسی!
اسی آواز کو کسی قدر بھاری کر کے اور لہجہ سنبھال کر زبیدہ نے کہا۔ "مجھے بس یہی کہنا۔ خدا کے لیے صنم کی تعلیم کیریئر کو خراب نہ کیجئے۔ اسے پڑھنے دیجئے۔ اور اس کی عمر ابھی شادی کے قابل نہیں ہے۔"

"میں بھی یہی چاہتا تھا۔" انھوں نے جواب دیا۔ "لیکن میں بڑا مجبور ہو گیا ہوں مجبوریاں کس طرح [illegible] اسی طرح زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ شاید اس نے آپ کو بتایا ہے۔ کہ دور و نزدیک کوئی ہمارا اپنا خواہ نہیں۔ میں نے اس کی شادی کا فیصلہ اسی لئے تو کیا ہے کہ اسے کوئی سہارا اور عصمت و آبرو کا نگہبان مل جائے تاکہ میں جب بھی مر جاؤں۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے کوئی ناقابل فہم اور ناقابل علاج مرض ہو گیا ہے۔ کہ اکثر [illegible] کمزوری مجھ پر غلبہ کر لیتی ہے۔ اور میں بیہوش ہو جاتا ہوں۔ یوں سمجھئے کہ موت کے منہ میں جا کر واپس آتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ میری بیہوشی موت کی نیند میں بدل گئی تو کیا ہو گا۔ اس عمر کی لڑکی اگر تنہا اور بے یار و مددگار ہو تو اسے اپنی جان اور آن بچانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے"

"لیکن" زبیدہ نے کہا "صنم نے بتایا تھا کہ اس کے نانا اور دادا [illegible] گھرانے ہیں۔ کچھ نیک۔۔۔۔!"

"ان کا ذکر رہنے دیجئے۔" انھوں نے [illegible] "ان لوگوں کو [illegible] نے چھوڑ دیا۔ انھوں نے ہمیں چھوڑ دیا [illegible] اور میرے لئے وہ مر چکے۔ اب کسی سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ [illegible] لوگ [illegible] سنگدل اور بے درد ہوتے ہیں۔ اس کا تجربہ ہے مجھے۔ اسی لئے میں کسی عزیز قریب کے حوالے اپنی بچی نہیں کر سکتا۔ مناسب یہی ہے کہ اسے اس کے شوہر کے سپرد کر دیا جائے۔ سب سے بہترین اور [illegible] محفوظ طریقہ یہی ہے۔"

"ایک بار پھر اپنے فیصلے پر غور کیجئے۔"

"بہت غور کر چکا ہوں بجز اس راستے کے دوسرا کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آتا" ان صاحب نے جواب دیا۔ "بہرحال آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے کم از کم اس بدنصیب کی ذات میں کچھ دلچسپی تو لی ہے [illegible] ہمدردی کی ہے اس کی

سے ۔ اچھا ۔ اب میں چلتا ہوں ۔ اس کی بہتری کے لئے دعا کیجئے گا ۔ خدا حافظ ۔"
ملازمہ کانی کی ٹرے لا رہی تھی لیکن انھوں نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں
پردہ ہٹایا اور نکلے چلے گئے ۔

افتخار احمد کیا تم ہمیشہ ہی ایسے جلدی کے فیصلے کیا کرو گے ۔ ایک بار کسی کو تباہ کر کے تمھیں سکون نہیں ملا ۔ اب تم اپنی اور میری بچی کی زندگیوں سے کھیلنا چاہتے ہو ۔ ظالم آدمی تو میرا خیال صحیح تھا کہ میری بچی کو تم ہی اٹھالے گئے تھے ۔ سنگدل بدرد پتھر آدمی ۔ اگر تمھیں علم ہو جائے کہ اس کی حقیقی ماں میں موجود ہوں ۔ تو تمھارا کیا عالم ہو گا تم اپنے نزدیک سب کو مردہ سمجھے بیٹھے ہوئے ہو ۔ کیا میں اپنی بچی کی یہ درگت بننے دوں گی ؟ شاید نہیں تو ۔

صنم پھر کالج نہیں آئی ۔ اور زبیدہ کے شب و روز کا قرار پھر لٹ گیا ۔ وہ صنم کو سینے سے لگانے کے لئے بے تاب تھیں ۔ اسے بتانے کے لئے بے قرار کہ وہ اس کی ماں تھیں ۔ اپنی زندگی کی کہانی اسے سنانا چاہتی تھیں مگر اس کہانی میں ایک الجھاؤ تھا ۔ ایک زبردست خامی ۔ اس کے باپ نے انھیں بد چلن بدکردار کہہ کر گھر سے نکالا تھا ۔ صنم وجہ ضرور پوچھتی ۔ انھیں جلا وطنی کیوں نصیب ہوئی تھی صرف جہالت ہی معقول وجہ نہ تھی ۔ ہزاروں ان پڑھ جاہل اور پھوہڑ عورتیں گرہستی سنبھالتی اور نانی دادی بن جاتی ہیں ۔ مگر بد چلنی ؟ نہیں انھیں کوئی دوسری کہانی سنانی پڑے گی ۔ ویسے اگر افتخار صاحب نے کچھ نہ سنا دیا ہو ۔

اوہ معبود میں بیس سال سے تڑپ رہی ہوں ۔ آج میری بچی میرے سامنے ہے ۔ میں اس سے نہیں کہہ سکتی کہ تیری ماں میں ہوں ۔ تو میری بیٹی ہے جسے تمھارا سنگدل باپ اٹھالے گیا تھا ۔ جسے تم اس قدر چاہتی ہو ۔ اس کی مرضی پر قربان ہو رہی ہو ۔ !

کیسے کہوں۔ کیا کروں۔؟ وہ بے قرار اور بے تاب تھیں۔ کوئی مناسب حل اس تجزیہ کا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اگر شبیر شبنم سے کچھ کہتی ہیں۔ تو وہ فوراً تحقیق حال کے لئے صنم کے گھر دوڑ پڑیں گے یا پھر انہی کو موردِ الزام ٹھہرائیں گے۔ کہ انھوں نے شروع ہی سے یہ بات کسی سے نہ کہی تھی؟۔ اتنی الجھن میں کیوں پڑی رہی تھیں کیسی ماں تھیں کہ ناقابل برداشت جبر کیا تھا۔

اور اس وقت زبیدہ شبیر احمد اپنا صبر و قرار کھو بیٹھی تھیں۔ اپنی تعلیمی دیپایں سنجیدہ سے شب و روز انھیں بے کار کا گورکھ دھندہ لگ رہے تھے۔ کیا فائدہ ہوا اپنی شخصیت پر اتنا دبیز ملمع کر کے؟ کیا حاصل ہوا اتنا پڑھ لکھ کے تھوڑی دیر کے لئے سب متحیر بے شک رہ گئے تھے۔ انھیں بھی ان کے تحیر و تعجب سے کچھ لذت ملی تھی۔ پھر اس کے بعد۔؟ کچھ ملا تھا ڈگریوں کے انبار سے؟ قلبی سکون، ذہنی راحت، جسمانی آرام، کچھ بھی نہیں۔ صرف دولت ملی تھی اور وہ کبھی وجہ مسرت کا سبب نہیں بن سکی تھی۔ بیکار پڑی تھی۔ نہ اس کی ضرورت انھیں نہ کسی اور کو۔ سب دولت کی طرف سے مطمئن تھے۔

اپنے لوگوں سے دور بچی سے جدا، شوہر کے لئے گمنام کیا ہے زندگی۔ آج جب کہ تقدیر نے ان کے شوہر اور بچی کو ان کے سامنے کھڑا کیا ہے۔ تب بھی وہ لا یعنی انتقام، لاحاصل آن اور کھوکھلی خودداری کے زعم میں گرفتار ان دونوں کو اپنے سے دور کر رہی تھیں۔

ان کا مقصد افتخار صاحب سے انتقام لینا تھا۔ لیکن انتقام کی آگ میں اولاد بھی جھلس رہی تھی۔ ان کی ہستی بکھر رہی تھی شخصیت ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ خیالوں کے مد و جزر انھیں کبھی کہیں اچھال رہے تھے کبھی کہیں۔ کوئی

مقام ہی نہ رہ گیا تھا۔
سب سے بڑی خلش جو دل میں ایک گہرے زخم کی طرح دکھ رہی تھی۔ وہ یہی تھی کہ حقیقت کے جاننے کے بعد افتخار نے صنم سے یہ کہہ دیا کہ "تمہاری ماں بدچلن تھی" تو پھر وہ صنم کو کیا منہ دکھائیں گی۔ تب کیا خودکشی ہی مقدر ہو کر رہ جائے گی۔؟

وہ اپنے کمرے میں بے تابی سے ٹہل رہی تھیں۔ دل سے ایک ہی صدا [illegible] تھی۔ میری بچی۔ میری نینا۔ ماتا جوالا مکھی بن کر پھٹ پڑنے کو تیار تھی۔ بیٹا! نے صنم کو سینے سے لگا لینے۔ جی بھر کے پیار کر لینے کے بعد خودکشی [illegible] آہ اس بدنصیب کو پتہ بھی نہ چلنے گا کہ جس سے اس نے اتنی محبت کی [illegible] کی طرف اس کا دل کھنچتا تھا۔ جسے کبھی نہ بھولنے کا وعدہ اس [illegible] خون کی کشش جسے اُن کے پاس کھینچ لائی تھی۔ وہ اُن کی ماں تھی۔
بے چاری محروم القسمت دولہن سسرال چلی جائے گی۔
اور اس نوبت پر آکر زبیدہ کے آنسو قابو سے باہر ہو گئے۔ [illegible]
اور بے اختیار ہو کر رونے لگیں۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ [illegible] ہر طرف [illegible] سناٹا۔ زبیدہ بشیر احمد ایک فیصلہ کر کے اٹھیں۔ اور شال لپیٹ کر باہر نکلیں۔ لیکن زینے کے سرے پر ٹھٹک کر رک گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ سنسان سڑک پر ایک قد آور سایہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا انہی کے گھر کی طرف آرہا تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلائے اس وجود کو دیکھتی رہیں۔ اور پھر گھبرا کر پلٹ کر آہستہ سے دروازہ بند کر لیا۔ ان کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔
کیا ہو رہا ہے۔ کیا بات ہے۔ اس وقت۔ افتخار احمد کا کیا

آپ نے اسے ٹھکرا دیا۔ اسے در در بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اتنے ہی ظلم کو آپ نے کافی نہیں سمجھا۔ اس پر بدچلنی، بدکرداری کا الزام لگایا۔ اسے مارا پیٹا۔ اسے گھر سے نکال دیا اور پھر اسے ایک سزا اور دی کہ اس کے سینے سے اس کا دل نوچ کے لے گئے۔ اس بدنصیب کی ماتا پر آپ کو ترس نہیں آیا۔ اس کے آنسوؤں نے آپ کے دل کو نہیں پگھلایا۔ اسکی تباہی نے اسکی ماں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آپ نے دوستی خوب نبھائی۔ آپ نے محبت کی خوب لاج رکھی۔ آپ کو یہی سزاوار تھا۔ اب آپ کو کون سی الجھن میرے پاس لائی ہے؟"

اور تب چونک کر انھوں نے دیکھا کہ افتخار صاحب کے مرجھائے ہوئے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ انھوں نے آنسوؤں کی زبان میں کہا۔

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے اپنے گناہوں کی سزا بھی تو پائی ہے۔ اپنی ناکردہ گناہ بیوی کو میں نے ستایا تھا۔ اپنی حسد کی ماری بھانجی کے بہکانے میں آکر اسے بدچلن بنایا تھا۔ حقیقت تو مجھے بعد کو معلوم ہوئی تھی۔ امرتے وقت اس نے ———!

"تو کیا وہ مر گئی!" دل تھام کے زبیدہ نے بے ساختہ پوچھا۔

"جی ہاں۔ ایک حادثہ میں اپاہج ہو گئی تھی۔" افتخار صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "اپنی زندگی سے تنگ آچکی تھی اس نے ایسڈ پی لیا۔ اور مرتے وقت اپنے گناہ کا اقرار کر گئی تھی۔ کہ کسی رشک نے اس سے وہ رکیک کام کروایا تھا۔ بہر حال۔ محترمہ۔ میں کیا عرض کروں۔ میرے اپنے گناہوں کی فہرست اگر طویل ہے تو سزاؤں کی فہرست بھی کم نہیں۔ میرے ماں باپ، بڑے بھائی، بیوی، چار بچے سب قدرت نے چھین لئے۔ میری سزاؤں

میں اب بھی کمی نہیں ہوئی ہے۔ میں اب اپنی بیوی صنم کی ماں کی یاد میں بےچین رہتا ہوں۔ یہاں آکے سب سے پوچھنا چاہتا تھا کہ امیر احمد صاحب کہاں ہیں۔ شاید ان سے کچھ معلوم ہو سکتا۔ مگر ہمت نہ پڑی۔ کیا صورت لے کے جاتا ان کے سامنے انھیں اپنی شکل دکھانے کے بجائے میں منہ چھپائے پھرتا ہوں ایک اضطراب ہے مجھے جو مجھے تھکائے دیتا ہے۔ اسی اضطراب اور بےچینی نے میری بیماری کی شکل اختیار کر لی ہے۔ دن رات خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ بس ایک دفعہ وہ مجھے مل جائے۔ میں ہاتھ جوڑ کے اس سے اپنی زیادتی کی معافی مانگ لوں۔ وہ مجھے چاہے نہ معاف کرتی لیکن اپنی بچی کی خاطر ایک بار وہ میرے گھر تو آتی۔ اپنی بچی کے سر سہرا باندھتی۔ اس کی مانگ میں سہاگ کی افشاں چنتی۔ آپ کو شاید بہت کچھ حالات معلوم ہیں۔ آپ کو خدا کا واسطہ بتائیے کہ صنم کی ماں کہاں ہے؟"

"مجھے معلوم ہے کہ صنم کی ماں کہاں ہے۔" زبیدہ اب بھی پگھلی نہ تھیں "لیکن وہ آپ کا سامنا کرنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ اب آپ اسکے قابل نہیں ہیں۔"

"مجھے لے چلئے اس کے پاس میں اس کے قدموں پر سر رکھ دوں گا۔ اس کی بچی کو لے جا کے اس کے سامنے کھڑا کر دوں گا۔ تب تو اسکا دل پسیجے گا۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔"

"آہ! میری تقدیر!" افتخار صاحب نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اپنا سر جھکا دیا۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہے پھر دفعتاً کھڑے ہو گئے۔ ایک نظر ادھر ڈالی جدھر زبیدہ کا ہیولا جانے کا سا نظر آرہا تھا۔ اور پھر باہر چلے گئے۔ زبیدہ نے بھاگ کر دیکھا۔ وہ اندھیرے اجالے میں گھلے ملے لڑکھڑاتے قدموں سے سنسان سڑک پر جا رہے تھے۔ زبیدہ کا جی چاہا کر وہ ایک لخت

ان کے پیچھے بھاگ پڑیں۔ مگر وہ اسی جگہ کھڑی روتی رہیں۔
اور ساری رات کی کشمکش کے بعد ایک ماں نے ایک ضدی عورت کو شکست دے دی۔ انھوں نے رضا صاحب کو فون کر کے اپنے ہاں آنے کی تاکید کی کہ وہ شائستہ شبیر اور شبنم کو بھی لیتے آئیں۔ اور پھر باغ کی راہ اتر کر ناریل کے جھنڈ میں چھپی تیلی کوٹھی کی طرف چل پڑیں۔
افتخار صاحب بے حد پژمردہ اور بدحال واپس آئے تھے۔ ان کا سارا جسم پھنک رہا تھا۔ آنکھوں میں چنگاریاں سی سلگ رہی تھیں۔ انھوں نے بڑی آہستگی سے اپنی بچی کے کمرے میں قدم رکھے۔
آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ صنم اپنے کمرے میں برآمدے کے سامنے پلنگ پر لیٹی بے خبر سو رہی تھی۔ چاند کی کرنیں اسے نور کا غسل دے رہی تھیں۔ کتنی حسین اور معصوم لگ رہی تھی۔ مظلوم، بے خبر، دکھی سی روح۔ باپ کی مرضی پر چپ چاپ سر جھکا دینے والی۔
"میری بچی!" ان کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر رو پڑیں۔ ان کے سینے میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اور انھوں نے دل تھام لیا۔
چاندنی اور اندھیرے کے داغ کمرے میں یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف چھوٹی سی انگیٹھی رکھی تھی۔ جس میں اب راکھ تھی۔ کہیں چنگاری نہ تھی۔ ان کی اپنی زندگی کی طرح۔ وہ باہر نکلے آسمان صاف تھا۔ لیکن اس کی نیل گوں پیشانی پر چاند کا ٹیکا جگمگا رہا تھا۔
"میرا سکون کہاں ہے؟" انھوں نے ایک سسکی لے کر زیر لب کہا۔ کب تک خون دل پینا ہوں گا۔ کیا کروں۔ خدایا کیا کروں؟"
دفعتہً چند آدمی اندھیرے سے نکل کر اجالے میں آئے۔ اور ان کی طرف بڑھنے لگے۔ افتخار صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر انھیں دیکھا۔ چور تھے۔ ہمسائے تھے۔ کون تھے۔ آدھی رات کو یہ چھ سات آدمی کیوں چلے آرہے تھے۔
چوکیدار نے گیٹ کیسے کھول دیا۔ جانے بوجھے بغیر وہ آگے بڑھے اور دفعتہً ان کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ چاندنی میں سب کے چہرے واضح ہونے

لگے۔ ان کے سامنے رضا صاحب، شبیر، شائستہ ایک اجنبی لڑکی اور ان کی اپنی گمشدہ زوبی کھڑی تھی۔

"پہچانا نہیں؟" رضا صاحب نے کہا۔ "بھول بیٹھے مجھ؟"

"رضا، تم میرے بھائی شبیر۔ اور۔ زبیدہ تم سب۔؟" وہ فرط حیرت و مسرت سے مغلوب ہو کر ہکلانے لگے۔ "میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے بازو میں چٹکی لو۔"

"خواب تو ہم دیکھ رہے ہیں۔" رضا صاحب نے کہا۔ اور بڑھ کر انھیں لپٹا لیا

"میرے دوست بے وفائی ہم نے نہیں کی۔" انھوں نے افتخار صاحب کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ "آج ماسا کی ماری زوبی نے مجھے فون کر کے کہا تھا۔ کہ تم اور غنیا مل گئے ہو۔ یہاں پہنچتے پہنچتے اس نے سارا قصہ سنا دیا تھا۔"

"افتخار۔ بچی کہاں ہے؟" انھوں نے افتخار صاحب کو سینہ سے جدا کیا۔ اور دیکھا۔ کہ رضا صاحب کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں!۔

"میں تم سب کا قصور وار ہوں۔" انھوں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ زبیدہ کا گنہگار ہوں۔ اس قابل نہیں کہ تم سب کو اپنی شکل دکھا سکوں میں تو معافی مانگتے شرماتا ہوں۔"

"افتخار بھائی آپ کو معلوم نہیں کہ جب گلے مل گئے تو بس سب گلے فراموش ہو گئے۔" شائستہ نے کہا "ہم نے آپ کو معاف کر دیا۔ زوبی نے آپ کی داستان غم سنائی تھی۔

"مگر زوبی کو میری داستان غم کا علم کیسے ہوا۔" اور ــــــ

افتخار صاحب ششدر تھے!۔

"افتخار بھائی" شبیر ہنسنے لگے۔ "یہ آپ کی بچی کی پرنسپل مس شبیرا احمد جن کے نام کے ساتھ ڈگریوں کی جھاڑ لگی ہے یہی آپ کی زبیدہ ہیں۔ دو تین دفعہ آپ ان سے ملے تھے۔ باتیں کی تھیں۔ مگر کیا صورت نہیں دیکھی آپ نے۔ آواز نہیں پہچانی؟" ــــــ "نہیں" حیرت کی زیادتی سے پاگل ہو کر افتخار صاحب زبیدہ کو گھورنے لگے۔ "بخدا نہیں۔ صورت میں نے دیکھی نہیں۔ آواز پر غور نہیں کیا۔ مگر۔ یہ کیا کیسے ہو گیا۔ یہ معجزہ کیونکر ظہور میں آیا۔ زوبی کی سی لڑکی اور یہ اعلیٰ تعلیم؟"

"اباّ نے پیشین گوئی کی تھی۔ یہ کوئی نامور شخصیت بنے گی۔" شائستہ نے کہا۔"
کے خواب کی تعبیر ہے۔ کوئی کمال نہیں کوئی معجزہ نہیں۔"

"نیناں کہاں ہے۔" شبیر نے پوچھا۔ "ہم اس سے ملنے کے لئے بیتاب تھ
"نیناں کون؟" افتخار صاحب نے کہا۔

"آپ کی بچی صنم۔" شبیر بولے۔ "ہم نے اس کا نام نینا رکھا تھا۔

"خدا کا واسطہ تمھیں شبیر۔" افتخار صاحب نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "میں۔
جو رکیک حرکت کی تھی۔ اس کا ذکر نہ کرنا۔ ان دنوں میں پاگل ہو گیا تھا۔ شیطان
سوار تھا مجھ پر! میں بہت عرصے تک خود کو لعنت ملامت کرتا رہا تھا۔
کر دو میرا یہ گناہ۔!

چلئے یہ بھی معاف کر دیا۔" شبیر ہنسنے لگے۔ پھر انھوں نے کہا۔ "آپ میر
سے ملیئے۔ یہ میری شبنم۔ ہاؤز سرجن ڈاکٹر شبنم!

"خوشی ہوئی تم سے مل کے بیٹی!" افتخار صاحب نے کہا۔ پھر بولے۔ "صنم
سو رہی ہے میں اسے جگا کر ــــ!" وہ مڑے تھے۔ مگر انھیں صنم کو جگانا
پڑا۔ وہ خود ہی جاگ چکی تھی اور حیرانسی دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی

"بیٹی آؤ۔ ان سب سے ملو۔" افتخار صاحب نے کہا۔ وہ پاس آگئی۔"
ہیں تمھارے بڑے چچا۔ رضا صاحب۔ اور یہ شبیر چچا ہیں۔ یہ تمھاری

"تعارف صحیح کرایئے بھائی جان۔" شبنم نے ہنس کر کہا۔ "یہاں چچا وغیر
کوئی نہیں۔ یہ سب ماموں اور خالو ہیں۔" پھر انھوں نے صنم کا ہاتھ تھ
کر اسے سینے سے لگا لیا۔ "بیٹی اپنی اماں سے بھی ملیں۔" رضا صاحب نے

"کہاں ہیں میری امی؟" صنم نے پوچھا۔ اس کی نظریں یکبارگی زبیدہ
پڑیں۔ انھوں نے کچھ کہے بغیر باہیں پھیلا دیں۔ اور وہ خوشی کی ایک